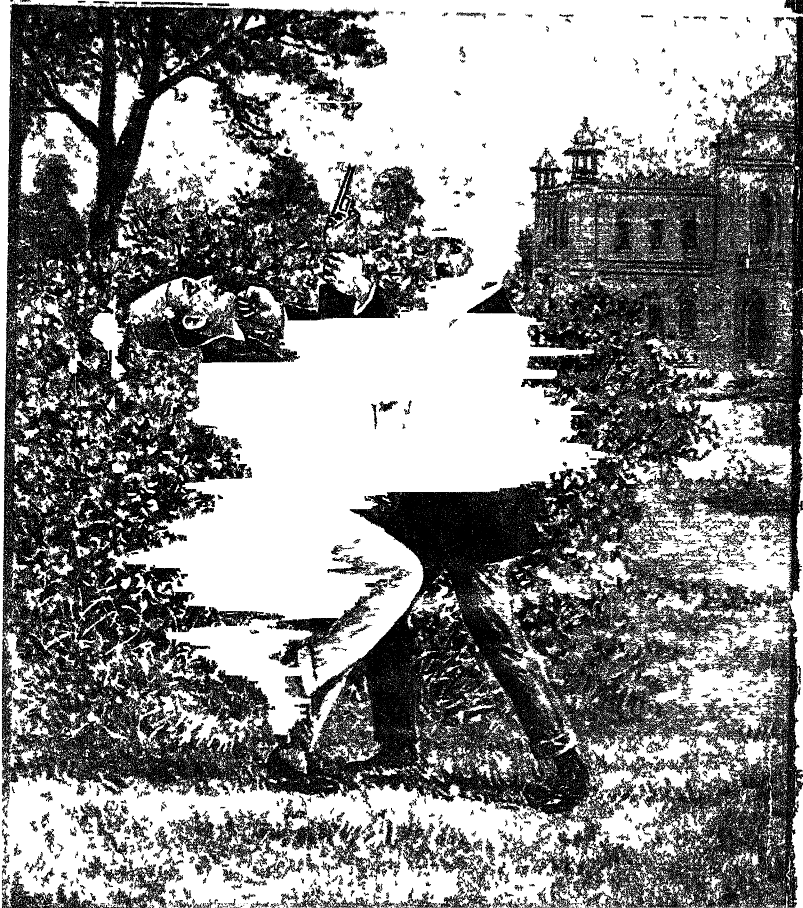
نیلی چھتری

مرتبہ

ظفر عمر، بی۔ اے



نیلی چھتری

یا

شاہانِ دہلی کا پوشیدہ خزانہ

مُرتبہ

ظفر عمر، بی، اے (علیگ)

سپرنٹنڈنٹ پولیس صوبہ متحدہ مُؤلف لیسمین

باہتمام خواجہ قطب الدین احمد

نامی پریس لکھنؤ میں باہتمام طبع ہوئی

باب ا

قاتل کی تلاش

فیروزہ بائی آہستہ آہستہ برابر کے کمرہ میں داخل ہوئی اور گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی۔

"بہن رتن کیا تم سوتی ہو! کچھ خبر بھی ہے؟"

رتن بائی (فیروزہ کے گلے میں باہیں ڈال کر) "میری فیروزہ تم ایک منٹ اور نہ آتیں تو میں سہم کر مرجاتی' نیچے کے کمرہ میں بڑی دیر سے آوازیں سنائی دے رہی ہیں خدا خیر کرے معلوم نہیں ابا جان سوتے ہیں یا جاگتے ہیں۔ دو دفعہ ہمت کرکے بستر سے اٹھی اور ارادہ کیا کہ انھیں جاکر جگاؤں مگر خوف کے مارے پیر لڑکھڑانے لگے اور ایک قدم بھی نہ چل سکی۔"

فیروزہ "میں نے کئی بار برقی بٹن دبایا' مگر کوئی نوکر نہ آیا' معلوم ہوتا ہے کہ چوروں نے گھنٹی کا تار بھی کاٹ دیا' آواز دینے کی ہمت نہ ہوئی' کتے بھی خاموش ہیں آؤ دونوں مل کے ابا جان کے کمرہ میں چلیں اور انھیں جگائیں"

فیروزہ رتن کی شال اٹھانے آگے بڑھی مگر جھجک کر رہ گئی۔ "وہ دیکھو فوارے کے پاس کوئی جا رہا ہے"

دونوں لڑکیاں کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئیں۔ سبز گھاس کے لان پر چاندنی

چھٹکی ہوئی تھی۔ فوارہ کے پاس ایک آدمی نظر آیا جو کوئی بوجھل اور لمبی چوڑی چیز بغل میں دبائے تیزی سے قدم بڑھائے پھاٹک کی طرف جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں نظر سے غائب ہو گیا۔ اس سے قیاس ہوا کہ پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اُدھر سے نظر ہٹائی تو دیکھا کہ ٹھیک اُنکے کمرہ کے نیچے ایک سیڑھی لگی ہے اور ملاقات کے کمرہ سے ایک آدمی کوئی وزنی چیز ہاتھ میں لیے سیڑھی سے اُتر رہا ہے۔ اتنے میں برابر کمرہ سے، جو مسٹر سہراب جی کے لکھنے پڑھنے اور کام کرنے کے لیے مخصوص تھا، دھماکے کی آواز آئی اور اسی کے ساتھ ایک وحشتناک چیخ سُنائی دی اور کچھ آہٹ ہونے کے بعد ایک اور دھماکا ہوا اور گرگراہٹ کی آواز آئی جیسے کبھی ذبح کے وقت جانوروں کے گلے سے نکلتی ہے۔

فیروزہ تیزی کے ساتھ گول کمرہ کی طرف دوڑی مگر ڈر کے مارے رتن کے حواس باختہ تھے اور وہ بار بار کہتی تھی "فیروزہ! خدا کے لیے مجھے اندھیرے میں اکیلا نہ چھوڑ" مگر بہادر فیروزہ رتن کا ہاتھ کھینچے ہوئے آگے بڑھی۔ غلام گردش میں ہو کر اور زینہ اُتر کے دونوں لڑکیاں ڈرائنگ روم کے دروازہ پر پہونچیں اور ششدر ہو کر رہ گئیں۔ ایک آدمی تین چار قدم کے فاصلہ پر نظر آیا جس نے برقی لیمپ کا بٹن دبا کر روشنی سے اُنکی آنکھوں میں چکاچوند ڈال دی۔ دیر تک وحشت زدہ لڑکیوں کو بغور دیکھتا رہا، پھر بہت اطمینان سے ٹوپی ہاتھ میں لی، کاغذ کے دو ایک پرزے زمین سے چُنے ایک دو جگہ نقش قدم مٹایا۔ اور بہت جھک کر اور مسکرا کر لڑکیوں کو سلام کیا اور غائب ہو گیا۔

رتن بائی فوراً اپنے باپ کی خوابگاہ کی طرف دوڑی، مگر دفتر کے کمرہ کے دروازہ پر اُسنے سخت ہیبتناک منظر دیکھا، فرش پر دو آدمی بظاہر مردہ پڑے تھے۔ ایک کی طرف جھکی اور بھرائی ہوئی آواز میں چیخی "ابا جان! ابا جان! خیر تو ہے!"

ایک لمحہ کے بعد مسٹر سہراب جی کے بدن کو حرکت ہوئی۔

"رتن گھبراؤ نہیں... میں اچھا ہوں... جہانگیر کا کیا حال ہے؟... مرا تو نہیں؟... جاقو! جاقو کہاں ہے؟" اتنے میں نوکر روشنی لیے پہونچ گئے۔ فیروزہ نے جھک کے جہانگیر کو دیکھا تو بالکل مُردہ پایا۔ گردن سے خون جاری تھا۔

فیروزہ کھڑی ہوگئی اور گول کمرہ سے ایک بندوق اُٹھا لائی اور چھجے پر جاکر ہر طرف ادھر اودھر دیکھنے لگی۔ برقی لیمپ والا آدمی ابھی مکان میں تھا اور احاطہ سے باہر نہ گیا ہوگا تھوڑی دیر میں اس نے دیکھا کہ ایک آدمی مقبرہ کے قریب درختوں کے سایہ میں جارہا ہے۔ فیروزہ نے بندوق چھتیائی اور فیر کیا۔ چور زمین پر گر پڑا پیچھے سے ایک نوکر بولا۔

"وہ مارا! نشانہ خوب کاری لگا! اب بچ کر کہاں جائے گا، میں نیچے جاکر اُسے پکڑتا ہوں"

فیروزہ۔ "نہیں خیراتی دیکھو وہ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ تم زینہ سے اُتر کر سیدھے پھاٹک پر جاؤ۔ سوائے وہاں کے اور کوئی نکلنے کا راستہ نہیں ہے"

خیراتی روانہ ہوا، لیکن وہ باغیچہ میں بھی نہ پہونچا تھا کہ چور پھر گر پڑا۔ فیروزہ نے دوسرے نوکر کو اشارہ سے بتایا۔

"چمن دیکھو اُس درخت کے پاس"

"ہاں بائی جی، صاف نظر آرہا ہے۔ لو پھر گھانس پر رینگنے لگا"

"چمن تم یہیں ٹھہرو اور اُسے خوب اچھی طرح نگاہ میں رکھو۔ اب بچ کر کہاں جائیگا؟"

فیروزہ بندوق اُٹھا کر زینہ کی طرف لپکی۔

چمن۔ "مگر بائی جی آپ اکیلی کہاں جاتی ہیں؟"

فیروزہ "میرا کچھ خیال نہ کرو، بندوق کی نال میں ابھی ایک کارتوس ہے اگر اب کی ہلا تو سہی۔"

فیروزہ باغ میں ہو کر مقبرہ کی طرف بڑھی۔ مگر جمن چلایا "چور گھسٹتا ہوا مقبرہ کے پیچھے ہو گیا اور اب نظر نہیں آتا۔ بی بی جی خبردار!"

فیروزہ۔ چور کا راستہ کاٹنے کے لیے دوسری طرف سے مقبرہ کے پیچھے گئی اور جمن کی نظر سے غائب ہو گئی۔ جب کئی منٹ ہو گئے تو جمن گھبرا کے مقبرہ کی طرف دوڑا۔ جب وہ اُس جگہ پہونچا جہاں اُسنے چور کو آخری بار گرتے دیکھا تھا تو فیروزہ اور خیراتی کو گھانس اور بیلے چنبیلی کے تھالوں میں ہر طرف ڈھونڈتے پایا۔

"کیوں ملا؟"

خیراتی "کم بخت یہیں کہیں غائب ہو گیا۔"

جمن "دروازہ کے راستہ تو نہیں نکل گیا؟"

خیراتی "ہرگز نہیں میں نے فوراً قفل لگا دیا تھا۔ یہ دیکھو کُنجی میری جیب میں ہے۔"

جمن "پھر کیا زمین نگل گئی؟"

خیراتی "جائیگا کہاں یہیں کہیں ہوگا۔ ذرا دیر میں ڈھونڈے لیتے ہیں۔"

بندوق کی آواز سُنکر باغ کا بڈھا مالی بھی اپنے لڑکے کے ساتھ وہاں آ پہونچا۔ اُس نے کسی آدمی کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔

سب نے مل کے مقبرہ کے چاروں طرف ڈھونڈھا۔ بیلے چنبیلی کے تھالے گلاب کی ٹٹیاں غرضکہ کوئی جگہ نہ چھوڑی، مگر چور کا کہیں پتا نہ تھا۔ صرف اتنا ہوا کہ جہاں گولی کھا کر چور پہلی مرتبہ گرا تھا وہاں ایک نہایت نرم اور قیمتی اونی ٹوپی پڑی ملی۔

باب ۲

تفتیش

قریب کے تھانہ میں صبح کے ۶ بجے اطلاع ہوئی۔ فوراً داروغہ شیر سنگھ روانۂ موقع ہوا۔ اور ساتھ ہی ایک رپورٹ قتل کے مختصر حالات کی حکام بالادست کے پاس بھیجی گئی۔ نیز یہ بھی لکھا گیا کہ قاتل زخمی ہوگیا ہے اور جلد دستیاب ہونے کی اُمید ہے۔ موقعہ پر اُس کی ٹوپی پڑی ملی اور آلۂ قتل بھی مل گیا ہے۔

۹ بجے کے قریب دو گاڑیاں موقعہ پر پہونچیں۔ ایک فٹن میں شہر دہلی کے کوتوال مرزا رحیم بیگ اور سب انسپکٹر شب سنگھ سوار تھے۔ ان کے ساتھ مرزا صاحب کا پیشدست منشی سالگرام بھی تھا۔ دوسری گاڑی میں دو مشہور اخباروں کے رپورٹر تھے۔

نورمحل جہاں یہ قتل ہوا، پُرانی عمارت تھی مگر اُس میں سہراب جی نے اپنے مذاق سلیم کی مدد سے زمانۂ حال کی ضرورت کے موافق ردوبدل کر لیا تھا۔ یہ مکان شاہجہان کے زمانہ میں کسی امیر کبیر نے تعمیر کرایا تھا۔ ایک بلند دیوار نور محل اور اُسکے پُر فضا باغات کو عوام کی نظروں سے چھپائے ہوئے تھی۔ نادر گردی میں ایرانی لٹیروں نے اِس مکان میں آگ لگادی تھی اور رہا سہا غدر کے پُرآشوب زمانہ میں برباد ہوگیا۔ امن قائم ہونے کے بعد مسٹر سہراب جی کے باپ نے کوڑیوں کے مول خرید لیا تھا۔ دولتمند تو تھا ہی ہزاروں روپئے لگا کر اُسے پھر ایک متمول سوداگر کے رہنے کے قابل بنا لیا۔ یہ مکان سہ منزلہ تھا، ملاقات اور دفتر کے کمرے دوسری منزل پر تھے۔ اس کے ایک سرے پر مسٹر سہراب جی کے سونے کا کمرہ تھا اور اُسکے مقابل میں اُسکا سکرٹیری مسٹر جہانگیر رہتا تھا۔ دونوں کے مکان کے دونوں جانب

اوپر چڑھنے کے لیے تھے۔ تیسری منزل سے جو مستورات کے لئے مخصوص تھی، چہار دیواری کے باہر ایک جانب شہر دہلی کی گنجان آبادی نظر آتی تھی، دوسری طرف شاہی قلعہ اور جامع مسجد کے لاجواب مناظر۔ باغ کے ایک گوشہ میں نہایت خوبصورت پرانی وضع کا چھوٹا سا سنگین مقبرہ تھا۔ مسٹر سہراب جی نے اس مقبرہ میں نہایت نادر الوجود کتبے کوروؤں پنڈوں تک کے زمانے کے سنگین بت اور آثار قدیمہ کے دوسرے نمونے بڑی خوبصورتی کے ساتھ سجائے تھے۔ یہ مقبرہ عموماً مقفل رہتا تھا۔ اس کے چاروں طرف بے شمار مجسمے اور یونان اور اٹلی کے بنے ہوئے بت، پرانی دہلی کے سنگین ستونوں پر باغ کی دلچسپی کو دوبالا کئے ہوئے تھے۔

مسٹر سہراب جی اس مکان میں اپنی اکلوتی بیٹی رتن بائی اور جہانگیر سکریٹری کے ساتھ رہتے تھے۔ دو تین سال سے انکی یتیم بھتیجی فیروزہ بھی ساتھ تھی۔ وہ ایک متمول سوداگر تھے اور جب سے ان کا خاندان دہلی آیا پرانے خاندانوں کی جائدادیں خرید کر بڑے زمینداروں میں شمار ہونے لگے تھے۔ جہانگیر ان کا پرانا معتمد تھا۔

موقعہ پر پہونچتے ہی مرزا رحیم بیگ نے داروغہ شیر سنگھ سے مقدمہ کے حالات دریافت کیے۔ مجرم باوجود تلاش کے ابھی تک نہیں ملا تھا، داروغہ شیر سنگھ نے ہر طرف اپنے آدمی لگا رکھے تھے اور مجرم کے فرار ہونے کا احتمال نہ تھا۔

سب لوگ مکان کی پہلی منزل سرسری طور پر دیکھتے ہوئے دوسری منزل پر پہونچے۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کہ ڈرائنگ روم (گول کمرہ) کی کوئی چیز اپنی جگہ سے نہ ہلی تھی اور تمام قیمتی چیزیں، نایاب پردے اور گلدان رادی ورما اور ٹیگور کے فن مصوری کے لاجواب نمونے سب اپنی اپنی جگہ پائے گئے۔

مرزا رحیم بیگ نے "اگر چور چوری کی نیت سے مکان میں داخل ہوئے تو یہ ظاہر ہے

کہ گول کمرہ کی کوئی چیز چرانا مقصود نہ تھا"

داروغہ شب سنگھ نے جو خاموش طبیعت آدمی تھا کوتوال صاحب کی رائے سے اختلاف کیا۔

مرزا رحیم بیگ "اسمیں شک ہی کیا ہے۔ چوری کی نیت ہوتی تو ان پردوں، سونے چاندی کے گلدانوں اور ان مشہور و معروف تصویروں سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی"

شب سنگھ "ممکن ہے چوروں کو لے جانے کا موقع نہ ملا ہو"

بات زیادہ بڑھنے نہ پائی تھی کہ مسٹر سہراب جی ڈاکٹر کو ساتھ لیے آپہونچے اور نہایت تپاک سے دونوں افسروں کا خیر مقدم کیا اور اپنے دفتر کا قفل کھولا۔

اس کمرے میں اب تک کسی کو نہیں آنے دیا تھا۔ اسکی حالت گول کمرہ سے بالکل مختلف تھی کئی کرسیاں اوندھی پڑی تھیں۔ ایک چھوٹی میز کے پرخچے ایک طرف پڑے تھے ایک جگہ لکھنے پڑھنے کا سامان گرا پڑا تھا، دو ایک چھوٹی تصویریں اور گلدان ادھر ادھر پڑے تھے۔ غرضکہ اسکی ہیئت کذائی سے صاف پایا جاتا تھا کہ یہاں خوب دھینگا مشتی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر نے لاش سے چادر ہٹائی۔ جہانگیر ہلکی فلالین کا سوٹ اور بھاری بوٹ پہنے ہوئے پیٹھ کے بل ایک ہاتھ نیچے دبائے پڑا تھا۔ کالر اور ٹائی ہٹا کر قمیص کھولی گئی تو سینہ پر ایک گہرا زخم نظر آیا۔

ڈاکٹر "چھری کا زخم ایسا کاری لگا ہے کہ بیچارہ جہانگیر فوراً جان بحق ہو گیا ہوگا"

مرزا رحیم بیگ "یہ زخم تو اس چھری کا معلوم ہوتا ہے جو ابھی ہم نے ملاقات کے کمرے میں اونی ٹوپی کے پاس دیکھی تھی"

مسٹر سہراب جی "جی ہاں۔ یہ چھری اسلحہ کی اس الماری سے لی گئی ہے جہاں سے میری بھتیجی فیروزہ نے بندوق اٹھا کر قاتل کو زخمی کیا ہے۔ رہی ٹوپی وہ بلا شک قاتل کی ہے"

مرزا رحیم بیگ نے اِدھر اُدھر ٹہل کے کمرے کی عام حالت کو دیکھا، دو ایک سوال ڈاکٹر سے کیے پھر مسٹر سہراب جی سے درخواست کی کہ جو کچھ معلوم ہو بیان کریں۔

سہراب جی "میرے سکرٹری جہانگیر نے مجھے چار بجے کے قریب جگایا۔ کچھ دیر سے میں بار بار چونک پڑتا تھا اور کچھ آہٹ کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ آنکھ کھولی تو جہانگیر کو موم بتی ہاتھ میں لیے اپنے سامنے کھڑا پایا۔ جہانگیر پورے لباس میں تھا کیونکہ وہ اکثر بہت رات گئے تک لکھا پڑھا کرتا تھا وہ بہت پریشان نظر آتا تھا اور کہنے لگا "گول کمرہ میں کوئی ہے" میں نے بھی آہٹ سنی بستر سے اُٹھا اور اپنے دفتر کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ اتنے میں گول کمرہ کا دروازہ کھُلا اور ایک آدمی نے لپک کر میری کنپٹی پر گھونسا مارا۔ میں بیہوش ہو کے گر پڑا۔ پھر مجھے کچھ خبر نہیں کیا ہوا۔ یہ سب واقعات آناً فاناً میں ہو گئے"

"پھر کیا ہوا؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔۔ ۔۔۔ میں بیہوش ہو گیا تھا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ جہانگیر میرے برابر زخمی پڑا ہے"

"آپ کسی پر شبہہ کرتے ہیں؟"

"نہیں"

"آپ کی کسی سے دشمنی ہے؟"

"میرا کوئی دشمن نہیں ہے"

"شاید مسٹر جہانگیر کا کوئی دشمن ہو؟"

"جہانگیر کا دشمن؟ جہانگیر بڑا نیک مزاج اور فرشتہ صفت آدمی تھا، پندرہ برس سے میرا سکرٹری تھا اور مجھے اُس پر پورا اعتماد تھا۔ اس سے سب لوگ بڑی محبت کرتے اور اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے"

"آخر اس قتل اور غارتگری سے مجرموں کا کیا مطلب تھا؟"

"نیت تو ظاہر ہے۔ سوائے چوری کے اور کچھ نہیں۔"

"چوری؟ کیا آپ کی کوئی چیز چوری گئی؟"

"نہیں کوئی چیز چوری نہیں گئی۔"

"پھر چوری کیسی؟"

"بظاہر اگرچہ کوئی چیز چوری نہیں گئی مگر مجرم کچھ اپنے ساتھ ضرور لے گئے ہیں۔"

"یہ کیا اسرار ہے؟"

"میں خود کچھ نہیں جانتا، مگر میری لڑکی اور بھتیجی آپ کو ٹھیک بتائیں گی۔ اُنھوں نے دو آدمیوں کو کوئی وزنی چیز لیجاتے اپنے کمرے سے دیکھا تھا۔"

"یہ عجیب تماشہ ہے؟"

"میری بھی یہی رائے ہے۔ صبح سے ہر طرف دیکھتے بھالتے اور لوگوں سے پوچھتے پوچھتے تھک گیا ہوں لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کیا چیز غائب ہے۔ مناسب ہوگا کہ دونوں لڑکیوں سے پھر پوچھا جائے۔"

فیروزہ اور رتن بلائی گئیں۔ رتن تو ابھی تک دہشت زدہ تھی اور سیدھی طرح بات بھی نہ کرسکتی تھی۔ لیکن فیروزہ نے جو رتن سے زیادہ خوبصورت، زیادہ باہمت اور زیادہ پرسحر آنکھوں والی تھی، بڑی بے تکلفی کے ساتھ رات کے تمام واقعات اور اپنی کارگزاری کے حالات بیان کیے۔

مرزا رحیم بیگ: "تو بائی جی آپ کے نزدیک مجرم کچھ چرا کے ضرور لے گئے۔؟"

فیروزہ بائی: "بیشک وہ آدمی لان کی طرف سے کچھ لیے جاتے تھے۔ میں نے اچھی طرح دیکھا ہے۔"

"اور تیسرا آدمی؟"

"وہ یہاں سے خالی ہاتھ گیا۔"

"کیا آپ اُس کا حلیہ بتا سکتی ہیں؟"

"اُس نے اپنے برقی لمپ سے ہمیں چوندھیا دیا تھا۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ وہ لمبے قد اور دوہرے بدن کا آدمی تھا۔"

"کیوں رتن بائی۔ کیا آپ کو بھی وہ آدمی ایسا ہی نظر آیا؟"

رتن بائی۔ (سوچکر) "ہاں بہنیں نہیں۔ میرے خیال میں وہ میانہ قد اور چھریرے بدن کا آدمی تھا۔"

مرزا رحیم بیگ۔ (مسکراکر) "ایک ہی واقعہ کے متعلق دو چشم دید گواہ اکثر متضاد بیان کیا کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں لیکن اب ہمیں ایک ایسے آدمی کی تلاش ہے جو لمبا بھی ہے اور اوسط قد کا بھی، موٹا بھی اور دُبلا بھی اور دو ایسے چور بھی ڈھونڈتا ہیں جو چوری کا مال بھی لیجاتے دیکھے گئے مگر کوئی چیز چُرا کے بھی نہیں لے گئے۔"

مرزا رحیم بیگ بڑا ہوشیار اور دوراندیش افسر تھا، مگر اپنی خوش مزاجی اور ظرافت طبعی کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ موقع ملا اور فقرے کسنا شروع کئے۔ اس سے تفتیش کی سنجیدگی اور روکھے پن میں نمک مرچ کا مزہ آجاتا تھا اور عوام بڑے شوق سے مرزا صاحب کی باتیں سُنتے تھے۔ چنانچہ اسوقت بھی وہاں علاوہ افسران پولیس اور دو اخبار نویسوں کے گھر کے نوکر، باغ کے مالی، دونوں گاڑیبان سب کے سب مرزا صاحب کے گرد جمع ہو گئے۔

مرزا صاحب "اب یہ معلوم کرنا ہے کہ تیسرا آدمی کس طرح غائب ہوا۔ کیوں بائی فیروزہ کیا اس بندوق سے آپ نے نشانہ لگایا تھا اور اس کھڑکی کے پاس سے؟"

فیروزہ "جی ہاں۔ قاتل اُس درخت کے پاس پہونچا تھا کہ میں نے زخمی کر دیا لیکن وہ کھڑا ہو گیا۔ اُٹھا ہی تھا کہ خیراتی دوڑ کے پھاٹک پر پہونچ گیا اور میں چمن کو یہاں نگہداشت کے لیے چھوڑ کے نیچے اُتر گئی۔"

اس کے بعد جمّن سے پوچھا۔

"کیوں میاں جمّن تمہارے نزدیک زخمی آدمی بائیں طرف کو نہیں گیا، کیونکہ تمہارا دوست خیراتی اس دروازہ پر تھا اور نہ دائیں جانب گیا ہے، اگر جاتا تو صاف میدان تھا، اُسے دیکھ لیتے۔ پس تمہارے نزدیک وہ چپہ بھر زمین میں غائب ہوگیا؟"

جمّن "جی ہاں سوائے وہاں کے اور کہیں نہیں جا سکتا۔"

فیروزہ اور خیراتی نے بھی اس سے اتفاق کیا۔

مرزا صاحب نے تمسخر سے کہا "اب کیا ہے۔ صرف اتنا کام ہے کہ جو تلاش چار گھنٹے سے اس چپہ بھر زمین پر جاری ہے اُسے قائم رکھا جائے!"

مرزا صاحب نے آتشدان سے ٹوپی اُٹھائی دیکھنے بھالنے کے بعد داروغہ شیر سنگھ سے چپکے سے کہا "داروغہ جی! فوراً ایک سوار چشتی کمپنی ابنارس بلڈنگ چاندنی چوک میں بھیجکر دریافت کرو کہ یہ ٹوپی کس کے ہاتھ بیچی تھی۔"

مرزا صاحب سب آدمیوں سمیت مقبرہ کی طرف آئے۔ اب تک جو بیانات ہوئے اُن سے ظاہر تھا کہ تیسرا آدمی سو قدم لمبے اور اسیقدر چوڑے قلعے کے حدود سے باہر نہیں گیا بیلے اور چنبیلی کے تھالے اور گلاب کی ٹٹیاں صبح سے کئی بار جھاڑی جا چکی تھیں اور اس آدمی کا کہیں پتا نہ تھا۔

گھاس پر دو جگہ جما ہوا خون جو اب بالکل خشک ہو چکا تھا نظر آیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں آدمی زخمی ہو کر گرا تھا اسکے بعد درختوں کی پت جھڑ کی وجہ سے گھاس پر کوئی نقش قدم نہ ملا لیکن جمّن اور فیروزہ بائی کی نظر سے بچکے زخمی جا کہاں سکتا تھا؟ مقبرہ مقفل تھا۔ مالی کو بلوا کر قفل کھلوایا گیا۔ مقبرہ میں ہر چیز قرینے سے رکھی تھی اور وہاں کوئی جگہ چھپنے کی نہ تھی۔

یہاں سے چلکر مشرقی پھاٹک پر آئے جو اکثر مقفل رہتا تھا اور صرف اُن لوگوں کے

لئے کھولا جاتا تھا جو اس تاریخی مقبرہ اور سہراب جی کے بتوں کے ذخیرے کو دیکھنے آتے تھے پھاٹک کے باہر سڑک پر موٹر کار کے پہیئے کے نشان دیکھ کر مرزا رحیم بیگ نے کہا کہ زخمی موٹر میں بیٹھ کر چلا گیا خیراتی: "مگر یہ ممکن نہیں میرے یہاں آنے سے پہلے موٹر کار جا چکی تھی اور جب میں یہاں پہونچا تو جمن اور فیروزہ بائی چور کو پیچھے سے دیکھ رہے تھے۔"

"آخر کیا چھلاوہ ہے۔ باہر گیا نہیں یہاں ہے نہیں، کیا زمین نگل گئی؟"

جمن اور خیراتی نے کہا "حضور کچھ بھی کہیں مگر وہ ہے یہیں کہیں"

مرزا صاحب پھر مکان کی طرف گئے۔ دیر تک ٹہلے اور سوچتے رہے۔ اتنے میں کھانے کا وقت آگیا اور سہراب جی نے دونوں افسروں اور اخبار نویسوں کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا جلد جلد خاموشی کے ساتھ کھانا ختم کرکے مرزا صاحب پھر گول کمرے میں گئے اور نوکروں سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں جو سوار ٹوپی کے متعلق حالات دریافت کرنے گیا تھا گھوڑا دوڑائے واپس آیا اور مرزا صاحب نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"کیوں کیا خبر لائے؟ کچھ سراغ چلا؟"

سوار "میں نے چشتی کی دوکان پر دریافت کیا۔ یہ ٹوپی ایک گاڑیبان خرید کے لے گیا ہے"

"گاڑی بان"؟

"جی حضور۔ ایک کرایہ کی گاڑی ہانکنے والا دوکان پر آیا اور کہا کہ ہوٹل میں ایک صاحب ٹھہرے ہیں انکے لیے ٹوپی درکار ہے۔ گاڑیبان بڑی جلدی میں تھا چھوٹی بڑی کا کچھ خیال نہ کیا۔ اس قسم کی صرف یہی ٹوپی تھی دام دے کر ٹوپی لے گیا۔"

"گاڑی کس قسم کی تھی"؟

"فٹن"

"اور کس دن کا واقعہ ہے؟"

"حضور آج ہی صبح کے آٹھ بجے۔"

"آج آٹھ بجے! سوچ سمجھ کر جواب دو؟"

"جی حضور آج ہی صبح کو۔"

"لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے! یہ ٹوپی تو کل رات باغ میں پڑی ملی تھی، اس لیے آج نہیں بلکہ کل یا اس سے پہلے خریدی گئی ہوگی۔"

"حضور مجھے خوب یاد ہے۔ خود چشتی صاحب نے آج صبح کو یہ ٹوپی گاڑی والے کے ہاتھ بھیجی ہے۔"

"حاضرین آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے سوار کو دیکھتے تھے۔ مرزا صاحب نے اپنا سر کھجایا اور ذرا اِدھر اُدھر ٹہلے۔ پھر یکایک چونک پڑے "اس فٹن والے کو تو بلاؤ جو آج صبح ہمیں یہاں لایا ہے! دوڑو جلد حاضر کرو۔"

داروغہ شیر سنگھ اور اُن کا اردلی دوڑ کر شاگرد پیشہ کے مکانات کی طرف گئے اور چند منٹ کے بعد داروغہ شیر سنگھ تنہا واپس آیا۔

مرزا صاحب "اور گاڑی والا! ساتھ کیوں نہ لائے۔؟"

شیر سنگھ "ابھی تھوڑی دیر ہوئی، نوکروں کے پاس چلم پی رہا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"کہیں چلا گیا۔"

"گاڑی سمیت؟"

"جی نہیں۔ سہراب جی کے سردار سے کہا کہ جلدی سے ایک دوست کو دیکھ آؤں۔"

بائیسکل دے دو۔ سوار ہو باہر چلا گیا اور اپنا کوٹ اور ٹوپی بھی چھوڑ گیا۔"

"تو ننگے سر گیا۔"

"جی نہیں۔ اپنی جیب سے ایک ٹوپی نکال کے اوڑھ لی تھی۔"

"ٹوپی! کس قسم کی تھی۔"

"نئی وضع کی روئیں دار۔"

"یہ دیکھو......یہ تو یہاں موجود ہے!"

"حضور۔ لیکن وہ ٹوپی بالکل ایسی ہی تھی۔"

مرزا صاحب (ہنسی کو روک کر) "کیا تماشہ ہے! اب ٹوپیاں بھی دو ہو گئیں ایک اصلی ایک نقلی۔ اصلی جس سے کچھ سُراغ چلنے کی امید تھی غائب ہو گئی اور اس کی جگہ دوسری ہمارے ہاتھ میں ہے۔ بدمعاش نے خوب چکمہ دیا۔"

شیر سنگھ سے مخاطب ہو کر "ابھی دو تین ہوشیار آدمی تلاش میں بھیجو۔ فوراً ڈھونڈ کے لائیں۔ سپاہیوں سے کہو سرپٹ جائیں۔"

"اب تک تو وہ بہت دور نکل گیا ہوگا۔"

"جائے گا کہاں۔ جہاں کہیں بھی ہو اُس کا ملنا شرط ہے۔"

"بہت بہتر ابھی حکم کی تعمیل ہوتی ہے لیکن حضور ذرا اس کاغذ کو بھی تو دیکھئے۔ گاڑی والے کی جیب سے نکلا ہے۔"

مرزا صاحب نے کاغذ کا پرزہ ہاتھ میں لیا معمولی سفید کاغذ پر پنسل سے لکھا ہوا تھا۔

"ہمارا سردار مر گیا تو فیروزہ بائی کی خیر نہیں!"

باب ۳

علی گڑھ کا طالب علم

اس کا پڑھنا تھا کہ سب کے سب چونک پڑے۔ مسٹر سہراب جی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

مرزا صاحب "سہراب جی آپ گھبرائیں نہیں اور نہ آپ فیروزہ بائی۔ ایسی دھمکی بیکار ہے یہاں پولیس موجود ہے اور میں آپ سب کی حفاظت کا معقول انتظام کر دونگا"

مرزا صاحب یکایک اخبار نویسوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک سے پوچھا۔

"آپ کس اخبار کے نامہ نگار ہیں"؟

"اخبار انیس ہند' دہلی"

"ثبوت"

"یہ کارڈ ملاحظہ ہو"

مرزا صاحب نے کارڈ دیکھ کر واپس کر دیا۔ پھر دوسرے مضمون نگار سے خطاب کیا

"اور آپ کس اخبار سے تعلق رکھتے ہیں؟"

"میں؟"

"جی آپ۔ جلد بتائیے"

"میں کسی خاص اخبار کا رپورٹر نہیں ہوں متعدد اخباروں میں مضمون بھیجتا ہوں"۔

"ثبوت؟ کوئی کاغذ ہے؟"

"میرے پاس کوئی تحریر نہیں؟"

"آخاہ، حضرت! اس کے کیا معنی؟"

"اخبار سے تحریر اُسی حالت میں ملتی ہے جب مالکان اخبار کی جانب سے کوئی باضابطہ رپورٹر ہو۔ میں کسی کا نوکر تو ہوں نہیں۔ جس اخبار میں دل چاہا مضمون بھیجدیا۔ چاہے چھپے یا نہ چھپے۔"

"خوب! تو آپ کا نام کیا ہے اور کیسے معلوم ہو کہ آپ نامہ نگار ہیں؟"

"جناب، آپ کو میرے نام سے کیا غرض۔ نام سے مقدمہ کا سُراغ چلنا تو ممکن نہیں پھر نام پوچھنے سے فائدہ؟"

"نہ آپ کے پاس کوئی نشانی ہے جس سے آپ کا پیشہ معلوم ہو؟"

"جناب میرا کوئی خاص پیشہ نہیں۔ جو دل میں آیا کرنے لگا۔"

مرزا صاحب (غصہ سے) "دیکھیے حضرت مذاق ہو چکا، آپ کو کیا مجاز تھا کہ آپ ایسے نازک اور اہم مقدمہ کی تفتیش میں اس دھوکہ سے شامل ہو جائیں اور پولیس کے راز کی باتیں معلوم کر لیں۔"

"جناب مرزا صاحب! آپ خفا نہ ہوں۔ یہاں آتے وقت آپ نے مجھ سے کوئی شرط نہیں کی تھی۔ نہ آپ نے اُس وقت کچھ پوچھا تھا۔ رہی رازداری اُسکا یہ حال ہے کہ خود مجرموں کا بھی ایک آدمی یہاں آگیا!"

نامہ نگار نے نہایت نرمی اور ادب سے گفتگو کی۔ اسکے سُرخ و سپید چہرہ سے پریشانی یا بناوٹ کے آثار ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ معمولی وضع کا کوٹ پتلون پہنے تھا اور سر پر ترکی ٹوپی چہرے باوجود لمبی اور پریشان داڑھی کے لڑکپن برستا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے ذہانت کا پتا چلتا تھا مرزا صاحب کے غصہ کے باوجود اسکے ہونٹوں پر تبسم موجود تھا لیکن مرزا صاحب اُسے مشتبہ سمجھ کر تیز نظر سے دیکھنے لگے۔ دو سپاہی آگے بڑھ کے نامہ نگار کے داہنے بائیں کھڑے ہو گئے۔

اس پر نامہ نگار نے ہنسکر کہا "مرزا صاحب آپ مجھپر مجرم ہونے کا شبہہ کرتے ہیں اگر

میں مجرموں میں سے ہوتا تو اب تک کبھی کا نکل گیا ہوتا جیسا کہ گاری بان غائب ہو گیا۔"

مرزا صاحب (غصہ سے) "بس دل لگی بہت ہو چکی۔ تمہارا نام؟"

"مسعود"

"کیا کام کرتے ہو اور کہاں رہتے ہو؟"

"اجی جناب میں تو انٹرنس کلاس کا طالب علم ہوں۔"

مرزا صاحب نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا "طالب علم!"

"جی ہاں علی گڑھ کالج کے اسکول میں پڑھتا ہوں"

"بس حضرت مذاق کی حد ہوتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس مذاق کی بدولت آپ کو جیلخانہ کی صورت دیکھنا پڑے۔"

"مرزا صاحب! آخر آپ مجھے جھوٹا اور دغا باز کیوں سمجھتے ہیں۔ علی گڑھ کا طالب علم ہونے پر شک کی وجہ؟ شاید آپ میری داڑھی کی وجہ سے ایسا کہتے ہیں لیجیے یہ مصنوعی داڑھی ہے۔" یہ کہکر مسعود نے مصنوعی داڑھی اُتار کر رکھدی اور سینہ پر دونوں ہاتھ باندھکر شرارت اور لڑکپن کی مجسم تصویر بن کے کھڑا ہو گیا۔ گالوں پر سُرخی بڑھ گئی، اور ہنس کر کہنے لگا "اب تو آپ کو یقین آیا۔ اگر مزید ثبوت درکار ہو تو لیجئے اس خط کا پتہ پڑھئے جو میرے والد کے پاس سے آیا ہے۔"

برخوردار میاں مسعود حسن سلمہٗ طالب علم ممتاز بورڈنگ ہوس علی گڑھ

مرزا صاحب جیسے تجربہ کار افسر کو اس لڑکے کی شرارت پسند نہ آئی "اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"جی۔ میں یوں ہی چلا آیا ...... اپنے دماغ کی اصلاح کرنے۔"

"دماغ کی اصلاح کے لیے مدرسہ ہی جہاں تم پڑھتے ہو یہاں تمھارا کیا کام؟"

"جناب میرے اسکول میں آج کل چھٹیاں ہیں۔"

"چھٹی اور اِس دخل درمعقولات سے کیا مطلب؟"

"جناب مجھے حق حاصل ہی کہ جس طرح چاہوں چھٹیاں مناؤں۔"

"تم چھٹیوں میں اپنے والدین کے پاس کیوں نہ گئے؟"

"جی میرے والدین بریلی میں رہتے ہیں۔ اُنھیں کی اجازت اور ہدایت سے دہلی کی سیر کو آیا ہوں۔"

"کیا تمھارے والد نے یہ بھی کہدیا تھا کہ مصنوعی داڑھی لگا کر لوگوں کو دق کرنا؟"

"جی نہیں اُنکا تو یہ حکم تھا کہ تفریح طبع کر آؤ۔ داڑھی کا قصہ ایجاد بندہ ہے۔ اسکول میں ہم لوگ شرلاک ہومز کے قصّے اور اسی طرح کے حیرت انگیز افسانے بکثرت پڑھتے ہیں اور اکثر بھیس بدل بدلکر ان قصوں کی مشق کرتے ہیں۔ ہمارے اُستاد بھی ان باتوں میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے سابق ہیڈ ماسٹر مسٹر کارناتے ایک قصہ بھی انگریزی نظم میں ہمارے لیے چھاپا ہی۔ ہملٹ اور مرچنٹ آف وینس، جنکی بدولت میاں شفقت اور عین الدین نے اِسقدر نام پیدا کیا۔ اب کالج میں دلچسپی سے نہیں دیکھے جاتے۔"

مرزا صاحب (بات کاٹ کر) "لیکن اخبار اور بڑے بڑے لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ علی گڑھ کے لڑکے رات دن پالٹیکس میں پڑے رہتے ہیں۔"

"جی یہ سب غلط ہی۔ بالکل بہتان ہی۔ لوگ جو کچھ پانیر میں پڑھتے ہیں سچ سمجھنے لگتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے سے ہمارا جو وقت بچتا ہی ہم عمدہ عمدہ کھیلوں اور سُراغ رسانی کے قصوں میں صرف کرتے ہیں۔ میں ایک ہفتے سے دہلی کی سیر کر رہا ہوں۔ کل میں نے ایک

مصنوعی داڑھی خریدی۔ آج صبح کو اپنے دوست نورالدین سے کوچہ پنڈت میں ملنے کو گیا تو اُس نے رات کے قتل کا حال سُنایا۔ داڑھی تو میرے پاس تھی ہی، دونوں نے گاڑی کرایہ کی اور یہاں پہونچ گئے۔“

یہ سب باتیں مسعود نے ایسے بھولے پن اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کیں کہ مرزا صاحب کو اپنے اسکول کا زمانہ اور لڑکپن کی شرارتیں یاد آگئیں اور ہنس کے کہنے لگے۔ ”تو تھیں یہاں آنے سے کوئی مفید سبق ملا، یا جیسا کہ تم کہتے ہو، دماغی تفریح ہوئی ؟“

”جی خوب۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ایسے سنگین مقدمہ کی ابتدائی تفتیش نہیں دیکھی تھی اور یہ مقدمہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات سے جو آپ کے سامنے بیان ہوئے، رفتہ رفتہ اچھا خاصہ ڈھانچہ تیار ہو گیا اور اصلی حالت کی تصویر نظر آنے لگی۔“

”خوب ! یہ کہیے ! میاں صاحبزادے آپ کو اصلی حالت کی تصویر نظر آنے لگی۔ اہا ہا ہا کیا تمھارا یہ مطلب ہے کہ تم معاملہ کی تہ کو پہونچ گئے ؟“

مسعود (ہنس کر) ”جی نہیں۔ میرا صرف یہ مطلب ہے کہ بعض باتیں ایسی صاف ہیں کہ اُن سے نتیجہ پر پہونچنا آسان نظر آتا ہے۔“

مرزا صاحب۔ ”اخاہ نتیجہ بھی نکالنے لگے۔ بھئی سچ پوچھتے ہو تو مجھ سے تم بازی لے گئے۔ میں نے تو ابھی تک کوئی رائے قائم نہیں کی اور نہ ابھی تک کوئی مفید مطلب بات معلوم ہوئی۔“

”اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ بیانات سُننے میں اس قدر محو رہے کہ غور کرنے اور سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ اصل چیز غور کرنا اور سوچنا ہے۔ سوچیے اور غور کیجیے تو ان

چھوٹے چھوٹے واقعات سے آپ بھی اُس نتیجے پر پہونچ جائیے گا جس پر میں پہونچا ہوں"

"کیا تمھارے نزدیک جو باتیں ہم نے اب تک سُنیں اُن سے کسی نتیجہ پر پہونچنا ممکن ہے؟"

"جی ہاں"

"خوب! اگر میں یہ دریافت کروں کہ کیا چیز چوری گئی ہے تو تم بتا سکو گے؟"

"جی ہاں! فوراً سے پیشتر۔ یہ تو بالکل صاف ہے"

"واہ مسعود، شاباش! تم تو مالک مکان سے بھی بڑھ گئے۔ مسٹر سہراب جی صبح سے دیکھ بھال کر رہے ہیں مگر اُن کے نزدیک کوئی چیز چوری نہیں گئی، گھر کے دوسرے آدمی بھی یہی کہتے ہیں کہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ اور اگر تم سے قاتل کا نام پوچھا جائے؟"

"میں پھر کہونگا کہ مجھے معلوم ہے"

جملہ حاضرین حیرت زدہ ہو گئے۔ سہراب جی اور دونوں لڑکیاں نیز اخبار کا رپورٹر اسکے قریب آ گئے۔

"تمھیں قاتل کا نام معلوم ہے؟"

"جی ہاں"

مرزا صاحب (جوش میں آکر) "ہم بھی قسمت کے دھنی ہیں یہ سنگین مقدمہ کیسا آسان ہو گیا ہے۔ اب باقی ہی کیا رہا۔ کیا تم مجھے یہ عجیب و غریب باتیں فوراً بتلا سکتے ہو؟"

"جی ہاں فوراً۔ لیکن بہتر ہوتا کہ کچھ دیر بعد پوچھئے تاکہ آپ کے ساتھ پوری تفتیش میں شریک ہو سکتا"

"جی نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ چکما کسی اور کو دینا۔ میاں صاحبزادے جو کچھ جانتے ہو فوراً بیان کر دو ورنہ۔۔" مرزا صاحب پورا جملہ نہ ختم کرنے پائے تھے کہ فیروزہ بائی نے جو بڑی دیر سے مسعود کو گھور رہی تھی آگے بڑھ کے مرزا صاحب سے کہا۔

"مرزا صاحب! مہربانی کر کے اِن سے یہ تو دریافت کیجئے کہ کل چکر کی سڑک پر اس دروازہ کے قریب یہ کس لیے ٹہل رہے تھے؟"

اس ناگہانی اور غیر متوقعہ سوال پر مسعود چونک پڑا اور گھبرا کے پوچھنے لگا۔

"کیوں بائی صاحب کیا میں ٹہل رہا تھا؟ میں؟"

فیروزہ بائی نے سکوت کیا اور ایک دفعہ بہت غور سے مسعود کو دیکھا جیسے کچھ شک رفع کر رہی ہے۔ اور پھر نہایت اطمینان سے کہا "کل شام کو چار بجے مَیں باغ سے واپس آ رہی تھی۔ میں نے ایک آدمی اِس شکل اور اسی قسم کے کپڑے پہنے اور ایسی ہی داڑھی والا پھاٹک کے قریب دیکھا تھا۔ اور ہاں اب یاد آیا۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ جلدی جلدی آگے کھسک گیا تھا۔"

"کیا وہ آدمی مَیں ہوں؟"

"یہ مَیں پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی۔ اُسوقت کچھ زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ لیکن شاید آپ ہی تھے، یا آپ کی صورت شکل کا کوئی دوسرا آدمی تھا۔"

مرزا صاحب کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ ایک آدمی آکر ٹوپی لے گیا، اب یہ دوسرا آدمی طالب علم کی صورت میں دھوکہ دینے کو آموجود ہوا۔ اگرچہ اُسکی بے تکلفی اور بھولے پن سے مجرم ہونے کا گمان نہیں ہوتا تھا لیکن مقدمات کی تفتیش میں ایسی چالاکی اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔

مرزا صاحب: "کہو میاں مسعود اب کیا کہتے ہو؟"

"فیروزہ بائی غلط کہتی ہیں، انھیں دھوکہ ہوا۔ میں کل چار بجے میرٹھ میں کرکٹ کھیل رہا تھا۔"

"یہ تمھیں ثابت کرنا پڑے گا۔ جب تک تمھارا میرٹھ ہونا ثابت نہ ہو حراست میں رہو گے۔ شیر سنگھ ایک آدمی سے کہو کہ انھیں حراست میں لے۔"

مسعود: "کیا مجھے دیر تک یہاں رہنا پڑے گا؟"

مرزا صاحب: "جب تک تمھاری بے گناہی کا پورا ثبوت مہیا نہ ہو جائے۔"

مسعود: "مرزا صاحب خدا کے لیے مجھے نہ روکیے۔ میرے والد مجھ سے بہت محبت رکھتے ہیں اگر انھیں میری گرفتاری کی خبر ہوگی تو سخت صدمہ پہونچے گا۔"

مسعود نے اس لجاجت سے کہا کہ مرزا صاحب پسیج گئے اور کہا کہ آج شام تک یا شاید کل تک نگرانی میں رہنا پڑے گا۔ مگر ابھی کوئی وعدہ نہیں کیا جا سکتا۔"

اس کے بعد مرزا صاحب نے پولیس افسران کو حکم دیا کہ کوئی غیر معتبر آدمی احاطۂ مکان میں نہ آنے پائے اور نہ کوئی باہر جانے پائے اور مقبرہ کے اردگرد پھر از سرِ نو کونہ کونہ ڈھونڈھا مگر کچھ سُراغ نہ چلا۔ بالآخر مرزا صاحب نے یہ رائے قائم کی کہ قاتل چہاردیواری کے باہر چلا گیا تاہم بخیال دُور اندیشی سخت تاکید کر دی کہ رات کو احاطۂ مکان میں پولیس کا پہرہ برابر قائم رہے اور کوتوالی چلے گئے۔

باب ۴
مسعود کی فراری

رات ہوگئی۔ جہانگیر کی نعش ڈاکٹری ملاحظہ کے لیے بھیجدی گئی پہلی منزل کے ایک کمرے میں مسعود کو بند کردیا گیا اور ایک سپاہی اُسکی نگرانی پر وہاں مامور ہوا۔ داروغہ شیر سنگھ نے دو آدمی مقبرے کے پاس تعینات کئے اور چند سپاہی موقع بموقع احاطہ کی دیوار کے کنارے کھڑے کردیے۔"

۱۱ بجے تک بالکل خاموشی رہی۔ ۱۱ بج کر ۱ منٹ پر نور محل کے مغربی گوشہ سے بندوق کی آواز آئی۔ اس کے سنتے ہی شیر سنگھ نے ڈانٹ کر کہا "فال ان! ننھے خاں اور گلاب سنگھ تم دونوں یہاں ٹھہرو باقی آدمی میرے ساتھ چلو۔ ڈبل مارچ"

سپاہی دوڑتے ہوئے احاطہ کے مغربی حصے میں داخل ہوئے ایک آدمی اندھیرے میں پیچھے ہٹتا ہوا معلوم ہوا۔ اتنے میں ایک فیر اور ہوا کچھ آگے جہاں پھونس کا بنگلہ بنا ہوا تھا، یہاں پہونچنے بھی نہ پائے تھے کہ بنگلہ کے چھپر میں شعلے اُٹھنے لگے۔ تھوڑی دور ہٹ کر باغبان نے مویشی کے لئے چارہ انبار کر رکھا تھا وہ بھی جلنے لگا۔

شیر سنگھ "بدمعاشوں نے آگ بھی لگادی۔ بچکر کہاں جائیں گے بڑھے چلو بہادرو"

لیکن ہوا تیز تھی اور شعلے بڑھنے لگے اور اندیشہ تھا کہ آگ بڑھتے بڑھتے نور محل تک نہ پہونچ جائے۔ سہراب جی بھی موقع پر پہونچ گئے اور تمام سپاہی اور نوکر

آگ بجھانے میں مصروف ہو گئے۔ سُہراب جی علٰحدہ کھڑے اِنعام واکرام کا وعدہ کر رہے تھے۔ آگ بجھاتے بجھاتے دو بج گئے۔ اب مجرموں کا پیچھا کرنا بے سُود تھا۔ شیر سنگھ نے اپنے آدمیوں کو جمع کیا اور واپس چلا "کچھ نشان تو چھوڑا ہی ہوگا۔ صبح کو ڈھونڈھ لیں گے اب رات میں اُنکا ملنا مشکل ہے۔"

سُہراب جی "لیکن پھونس کے بنگلے اور چری کے ڈھیروں میں آگ لگانے سے کیا فائدہ؟"

شیر سنگھ "واپس چلئے۔ معلوم ہو جائے گا۔"

سب لوگ ساتھ ساتھ مقبرہ کے قریب پہونچے، تو دونوں سپاہیوں کو جو وہاں پہرہ پر تھے غائب پایا۔

"ننھے خاں!.... گلاب سنگھ! کہاں گئے؟" کچھ جواب نہ آیا۔ چاروں طرف سپاہی دوڑ پڑے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ چہار دیواری کے پھاٹک کے قریب ننھے خاں اور گلاب سنگھ ہاتھ پاؤں بندھے لمبے لمبے لیٹے ہوئے ہیں مُنھ میں کپڑا ٹھونسا ہے، آنکھوں پر مضبوط پٹی۔

شیر سنگھ "مسٹر سہراب جی! ہم نے بڑا دھوکا کھایا؟ غضب ہو گیا۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"آہ۔ آپ نہیں سمجھے۔ بنگلہ اور گھاس میں آگ لگانا، فیر کرنا، یہ سب اس لیے تھا کہ ہم وہاں دوڑ جائیں اور بدمعاش موقع پاکر اپنا کام کر گئے۔"

"آخر کیا کر گئے؟"

"زخمی آدمی کو باہر نکال لے گئے۔"

"نہیں ایسا ہو نہیں سکتا"

"جی یہ تو بالکل صاف ہی۔ ابھی دس منٹ ہوئے میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کاش میں نے پہلے سوچا ہوتا! کیا تماشہ ہوتا۔ سب بمعاش گرفتار ہو جاتے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہی؟ شکار ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن مسٹر سہراب جی کیسے غضب کی بات ہی کہ دن بھر سب لوگ اس چپہ بھر زمین کو ڈھونڈتے رہے ایسا کیا سوئی تھی کہ غائب ہو گئی۔ بڑے تعجب اور حیرت کی بات ہی۔ یہ تو جادو کا کارخانہ معلوم ہوتا ہی"

غریب شیر سنگھ کے لیے یہ آخری حیرت نہ تھی کیوں کہ جب صبح ہوئی اور اُس کمرہ میں داخل ہوا جس میں مسعود حسن کو بند کیا گیا تھا تو اُسے غائب پایا۔ جو سپاہی حفاظت پر تعینات تھا ایک مونڈھے پر بے ہوش سو رہا تھا۔ پانی کا ایک آبخورہ پاس رکھا تھا دیکھا تو اس میں کوئی سفید چیز پیندے میں جمی پائی گئی۔

غور کرنے سے معلوم ہوا کہ میاں مسعود نے سپاہی کے پانی میں کوئی چیز ڈال دی جس سے سپاہی بیہوش ہو گیا۔ نکلنے کے لئے صرف ایک کھڑکی تھی جو کسی قدر اونچی تھی، غالبًا مسعود اس سپاہی کے کندھے پر پیر رکھ کر کھڑکی تک پہونچا ہوگا

باب ۵

نیا شگوفہ

اُس دن دہلی کے ہر گلی کوچہ میں اخبار "انیس ھند" کا یہ مضمون حیرت واستعجاب سے پڑھا جارہا تھا۔

تازہ خبر

ڈاکٹر شیرازی کا بھگا لیجانا

بدمعاشوں کی حیرت انگیز کارروائی

اخبار چھپ کر قریب تیار تھا کہ ہمیں ایک عجیب وغریب اطلاع ملی چونکہ ایسے واقعات وہم وگمان سے خارج ہیں اسکے باور کرنے میں ہمیں خود تامل ہے۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے من وعن پیش کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اپنے ناظرین سے استدعا کرتے ہیں کہ اُسے "تجاہلِ عامیانہ" کے مضامین کا سلسلہ نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ ہمارا ذریعۂ خبر بہت معتبر ہے:۔

کل شب کو ہمارے شہر کے مشہور وہر دل عزیز ڈاکٹر شیرازی صاحب جن کے دستِ شفا کا چرچا جنگ بلقان کے زمانہ سے یورپ تک پہونچ گیا ہے اپنے چند احباب کے ساتھ کوٹھی فردوس نما کے ماہواری مشاعرہ میں شریک تھے۔ دس بجے کے قریب تین آدمی آگے بڑھے اور ایک نے جو پرتکلف لباس میں تھا، جھک کر ڈاکٹر صاحب کے کان میں کہا۔

"ڈاکٹر صاحب معاف فرمائیے میں ایک نازک اور اہم خدمت پر مامور ہوں اور اس سلسلہ میں مجھے آپ کو تکلیف دینے کی ضرورت پڑی ہے، امید ہے کہ آپ بلا کسی عذر وحیلہ کے مجھے اپنی خدمت کی بجاآوری میں مدد دینگے۔"

"آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

"میں عبدالحمید خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوں اور آپ کو فوراً سپرنٹنڈنٹ صاحب پولیس کے پاس لے جانے پر مامور ہوا ہوں۔"

"لیکن ... ..."

"بس جناب ایک لفظ زبان سے نہ نکالیے۔ معاملہ نہایت نازک ہے کسی اشارہ تک کی گنجائش نہیں ہے۔ آپ گھبرائیے نہیں مشاعرہ ختم ہونے سے پہلے آپ واپس آجائیں گے۔"

مشاعرہ خوب گرم تھا اور سب لوگ تحسین وآفرین کی صداؤں میں اسقدر محو تھے کہ سوائے مسٹر عبدالرحمن کے جو ڈاکٹر صاحب کے قریب بیٹھے تھے اور کسی نے یہ گفتگو نہ سنی۔ ڈاکٹر صاحب بلا کسی کمزوری کا اظہار کئے فوراً کھڑے ہوگئے اور انہی کے ساتھ باہر چلے گئے۔ مشاعرہ ختم ہوگیا لیکن ڈاکٹر صاحب واپس نہ آئے مسٹر عبدالرحمن کو تردد ہوا اور گاڑی پر سوار ہو سیدھے کمشنر صاحب پولیس کے دفتر میں پہونچے لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ خاں صاحب عبدالحمید خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ موجود ہیں اور انھیں ڈاکٹر صاحب کی بابت کچھ علم نہیں کہ کہاں ہیں۔ کوئی شخص دھوکہ دے کے ڈاکٹر صاحب کو کہیں لے گیا۔ فوراً پوچھ گچھ شروع ہوگئی مگر اسوقت تک صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر صاحب تین آدمیوں کے ساتھ ایک موٹر کار پر سوار ہوکے

نظام الدین اولیاء کی طرف چلے گئے۔

ناظرین انیس ھند کو شام کی غیر معمولی اشاعت میں اس حیرت انگیز واقعہ کے مزید حالات معلوم ہوں گے۔"

شام ہونے بھی نہ پائی کہ اخبار انیس ہند کا غیر معمولی پرچہ شائع ہوا اور ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا اور جو خبر پہلے پرچہ میں اسقدر غیر قابل یقین خیال کی جاتی تھی ذیل کے مضمون سے سچ ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر شیرازی کی واپسی

"آج صبح ۸ بجے ڈاکٹر صاحب ایک موٹر کار پر سوار اپنے مطب واقع فتحپوری میں پہونچے موٹر کار پوری تیزی کے ساتھ فوراً قلعہ کی جانب روانہ ہوگئی۔

ڈاکٹر صاحب کا معمول ہے کہ ہر روز صبح کو آٹھ بجے اپنے مطب میں تشریف لاتے ہیں ٹیلیفون کے ذریعہ سے ہمیں فوراً اطلاع ہوگئی چنانچہ ہمارا خاص نامہ نگار ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باوجود خفیہ پولیس کے افسران کی موجودگی اور دیگر مصروفیتوں کے ڈاکٹر صاحب نے ہمارے نامہ نگار سے مفصلہ ذیل گفتگو کی:—

"میں صرف اسقدر بتا سکتا ہوں کہ میرے ہمراہی میرے ساتھ نہایت اخلاق اور بے تکلفی سے پیش آئے۔ اُنکی ظرافت اور بذلہ سنجی اس پایہ کی تھی کہ مشاعرہ کی دلچسپ مجلس چھوڑنے کا عین اسوقت جبکہ میر محفوظ علی صاحب اپنی غزل کا مطلع پڑھ رہے تھے، مجھے مطلق افسوس نہ ہوا۔ اگرچہ منزلِ مقصود دور تھی مگر ان لوگوں کے لطفِ بیان سے راستہ بڑے مزے کے ساتھ طے ہوا۔"

"اس سفر میں کتنا وقت صرف ہوا ہوگا؟"

"کوئی دو گھنٹے"

"اور اس دور و دراز سفر سے کیا مطلب تھا؟"

"مجھے ایک مریض کے پاس لے گئے جس پر فوراً عملِ جراحی کرنا ناگزیر تھا"

"کیا آپریشن کامیاب ثابت ہوا؟"

"بظاہر تو کامیابی نظر آتی ہے۔ مگر وہ جگہ بہت کثیف تھی ممکن ہے کہ نتیجہ خراب ہو"

"کس قسم کی کثافت؟"

"ایک بہت تنگ و تاریک مقام شاید کسی اصطبل یا سرائے کی کوٹھری جس میں تیمارداری مشکل ہے"

"پھر مریض کے بچنے کی کوئی اُمید؟"

"ہے مُشکل۔۔۔ ۔۔۔مگر اُس کے قویٰ بہت مضبوط ہیں اس وجہ سے شاید سب صعوبتیں جھیل جائے"

"کیا آپ اس عجیب و غریب مریض کا اور کچھ حال نہیں تبلا سکتے"؟

"جی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اول تو میں رازداری کی قسم کھا چکا ہوں۔ دوسرا آپریشن کرنے کی اُجرت مجھے دس ہزار روپیہ ملی ہے۔ اگر میں اس راز کو پوشیدہ نہ رکھونگا تو شاید یہ معقول رقم واپس لے لی جائے گی"

"واپس لینے کی بھی ایک رہی۔ آپ مذاق کرتے ہیں؟"

"مذاق کی کوئی بات نہیں۔ وہ لوگ بڑے منچلے اور اپنی بات کے پکے معلوم ہوتے ہیں"

یہ لب لباب ہے اُس گفتگو کا جو ڈاکٹر صاحب نے ہمارے نامہ نگار سے کی ہے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ باوجود سخت اصرار کے ڈاکٹر صاحب نے خُفیہ پولیس کے افسرِ اعلیٰ کو بھی کوئی اور حال نہیں بتایا ہے۔ ایسی حالت میں اس معمّہ کا حل کرنا مُشکل ہے"

چونکہ تمام اخباروں میں نور محل کے قتل کے واقعات بہت تفصیل کے ساتھ چھپ چکے تھے اسلیئے بعض ذہین آدمیوں کے لیے مشہور ترین ڈاکٹر کے بھگا لیجانے اور چوروں کے سردار کے زخمی ہونے کو زنجیر کی مختلف کڑیاں سمجھ لینا مشکل نہ تھا۔ تفتیش سے جو باتیں ابتک معلوم ہوئی تھیں اُن سے بھی اِس خیال کی تائید ہوتی تھی۔ جو گاڑی والا ٹوپی بدل کرکے گیا تھا اُسکا پیچھا کرنے سے اس قدر معلوم ہوا کہ تیز رفتار سے چھ سات میل شہر کے باہر نکل گیا اور وہاں ایک خندق میں بائیسکل پھینک کر ہستنا پور کے تار گھر پہونچا جہاں سے اُسنے ذیل کا تار روانہ کیا۔

ب۔ م۔ ڈاکخانہ بلی ماراں، دہلی۔

"حالت بہت نازک۔ اپریشن کی فوراً ضرورت۔ شاہراہ سے بہترین بھیجو"

معاملہ بالکل صاف تھا جسوقت چوروں کو اپنے سردار کی نازک حالت کا علم ہوا فوراً ضروری انتظام کرنا شروع کردیا۔ دہلی کے بہترین ڈاکٹر کو دس بجے مشاعرہ سے بُلاکر شاہراہ یعنی پُرانی بادشاہی سڑک کے راستہ سے نور محل لے آئے اور پھر احاطہ کے گوشہ میں آگ لگاکر مالک مکان اور محافظوں کو اُس طرف متوجہ کردیا اور موقع پاکے زخمی آدمی کو پاس کی سرائے میں اُٹھالے گئے جہاں ڈاکٹر شیرازی نے اپریشن کیا۔

اس قدر معلوم ہوجانے کے بعد انسپکٹر وقار حسین اور کنور شب سنگھ سراغرسانی کے لئے خاص طور پر مامور ہوئے۔ اُنکی تفتیش سے بھی پورا یقین ہوگیا۔ رات کو ۱۲ بجے کے قریب ایک موٹر کار نور محل کے قریب آئی تھی اور پھاٹک سے کچھ دور کھڑی کی گئی۔ یہاں سے پھاٹک تک نقش قدم بھی پائے گئے۔ علاوہ اسکے پھاٹک کا قفل بھی ٹوٹا ہوا تھا۔

وقار حسین ایک ذہین اور محنتی افسر تھا اور تمام دن آس پاس کی سراؤں اور اصطبلوں کی



[illegible] میں [illegible] لیکن [illegible] سرائے یا اصطبل کا ذکر ڈاکٹر شیرازی نے کیا تھا نہ ہاتھ [illegible] ملی۔ کسی کام کو ادھورا چھوڑنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ وقار حسین رات کو تو محل میں سویا [illegible] اُٹھا تو پہرہ [illegible] کی زبانی معلوم ہوا کہ آدھی رات کے قریب ایک آدمی تنہا احاطہ کے باہر گھومتا ہوا نظر آیا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ وہ چوروں کا آدمی تھا جو کچھ حالات دریافت کرنے یا اپنے سردار کی تلاش میں آیا تھا۔ اُس دن وقار حسین نے پہرہ کے سپاہیوں کو احاطہ کے دوسری جانب بھیجدیا اور پھاٹک کے قریب میدان میں رشب سنگھ کے ساتھ خود پہرہ دینے لگا۔ آدھی رات سے کچھ پہلے ایک آدمی سامنے کے باغ سے سیدھا پھاٹک کی طرف آیا۔ دونوں افسر ایک درخت کی آڑ میں ہو گئے۔ پھاٹک کھُلا ہوا تھا۔ آدمی بے تکلف اندر چلا گیا۔ تین گھنٹہ تک مقبرہ کے آس پاس تمام چیزوں کو غور سے دیکھتا پھرا۔ کبھی کسی درخت کے نیچے کئی کئی منٹ تک کھڑا رہتا۔ کبھی کسی چیز پر سر رکھ کر غور کرتا۔ کبھی سنگین بتوں کو آہستہ آہستہ اُنگلی سے بجاتا۔ بالآخر پھر پھاٹک پر آیا اور جوں ہی باہر قدم نکالا، وقار حسین اور رشب سنگھ نے مشکیں کس لیں۔ اس شخص نے اپنے چھُڑانے یا بھاگنے کی مطلق کوشش نہ کی اور افسروں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ وہاں جاکر احوال پوچھا تو صرف یہ کہا کہ سوائے مرزا رحیم بیگ کے اور کسی کے سامنے کچھ بیان نہ کرونگا۔ ایک کمرہ میں چارپائی پر لٹا کر رسیوں سے خوب مضبوط جکڑ دیا اور پہرہ کا معقول انتظام کر دیا گیا۔ صبح کو ۹ بجے کے قریب مرزا صاحب موقعہ پر پہونچے اور بڑی بیتابی سے قیدی کے لائے جانے کا حکم دیا۔ قیدی سامنے آیا تو دیکھتے کیا ہیں کہ میاں مسعود حسن ہیں۔

باب ۶

قاتل مل گیا

"اخاہ! میاں مسعود تم ہو! تم سے مل کر بڑی مسرت ہوئی!۔

"شب سنگھ! مسعود صاحب سے ہاتھ ملاؤ۔ آپ انٹرنس کلاس کے طالب علم ہیں۔ ان کے لڑکپن پر تعجب نہ کرو۔ یہ حضرت بڑی خوبیوں کے ہیں اور ہم اور آپ ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ بھئی خوب ملے میاں مسعود!"

"اس پر مسعود نے ہنس کر شب سنگھ کو فراشی سلام کیا۔ پھر مرزا صاحب سے پوچھنے لگا۔

"کیوں جناب مرزا صاحب۔ غالباً آپ کو میرا ٹھیک ٹھیک حال معلوم ہو گیا ہوگا؟"

"بالکل! تم ٹھیک کہتے تھے۔ فیروزہ بائی نے جس وقت تمھیں پھاٹک کے باہر دیکھنا بتایا تھا اُس وقت در اصل تم میرٹھ میں کرکٹ میچ کھیل رہے تھے اور شام کی گاڑی سے دہلی واپس آئے ہو۔ لیکن تمھاری شکل کا جو آدمی دیکھا گیا اُس کا پتہ چلنا دشوار نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ تمھارا نام مسعود حسن ہے اور تم ممتاز بورڈنگ علی گڑھ میں رہتے ہو اور انٹرنس کلاس کے طالب علم ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم بڑے ذہین اور محنتی لڑکے ہو نہ صرف طالب علم، تمھارے اُستاد مسٹر قائم حسین بھی تمھاری بہت تعریف کرتے ہیں"

"تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"تم آزاد ہو"

"بلا کسی شرط کے؟"

جی ہاں - صرف اس قدر کہنا ہے کہ جو آدمی کسی پولیسمین کو نیند لانے اور
کرنے والی دوا پلائے یا دوسروں کے مکانات میں رات کو مداخلت بیجا کرتے
گرفتار ہو اُسے بلا کسی معاوضہ کے چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔"

ارشاد ہو - حاضر ہوں۔"

بہت خوب - اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمھاری تفتیش کہاں تک پہونچی ہے - دو دن کی
میں تم نے اور بہت سی کام کی باتیں معلوم کی ہونگی؟"

سنگھ اور انسپکٹر وقار حسین کو یہ طفلانہ باتیں پسند نہ آئیں اور چلنے کے لیے
گر مرزا صاحب نے کہا "آپ ان باتوں کو حقیر نہ سمجھئے اور مسعود کی باتیں سُنئیے -
خود علی گڑھ جا کے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میاں مسعود بڑے ذہین اور رشاہد
تیز ہیں - تمام کالج میں ان کا شہرہ ہے - میر ولایت حسین صاحب تو یہ کہتے تھے
کا شاگرد آگے چل کر ہندوستان کا شرلاک ہومز ہوگا۔"

وقار حسین "بہتر ہے۔"

مرزا صاحب (مسعود سے) "تمھارے ایک دوست نے مجھے لکھا ہے کہ ایسے
ت میں تم جو کچھ کہتے ہو ہمیشہ سچ ہوا کرتا ہے - دیکھو اپنے دوست اور اپنے
شہرت کو قائم رکھنا۔"

مسعود نے خاموشی سے سُنا اور ہنس کر جواب دیا "مرزا صاحب آپ جیسے
افسر کو بے چارہ طالب علموں پر جو سیر و تفریح میں مصروف ہوں ایسے فقرے
اسب نہیں لیکن آپ اطمینان فرمائیے میں جو کچھ کہونگا صحیح ہوگا اور
ہنسنے اور مذاق اُڑانے کا موقع نہ دونگا۔"

مرزا صاحب "اصلح ہو کہ اس مقدمہ کی بابت تمھیں کچھ بھی معلوم نہیں"

"آپ سچ کہتے ہیں دو چار باتیں جو مین نے دریافت کی ہیں انھیں مقدمہ کے حالات معلوم کرنا نہیں کہہ سکتے، اور خود آپ کو بھی معلوم ہو گئی ہونگی"

"مثلاً؟"

"مثلاً کیا چیز چوری گئی"

"آخاہ! تو تمھیں معلوم ہو کیا چیز چوری گئی؟"

"جی ہاں۔ یہ تو بالکل آسان تھا اور سب سے پہلے میں نے اسی طرف توجہ کی اور اب تو آپ کو بھی معلوم ہو گیا ہو گا"

"کیا تمھارے نزدیک اس کا معلوم کر لینا آسان ہو؟"

"جی ہاں۔ صرف غور و فکر کی ضرورت ہو"

"بس اور کسی چیز کی نہیں؟"

"جی نہیں"

"پھر تمھارے غور و فکر کا نتیجہ کیا ہو؟"

"اول تو یہ کہ چوری ضرور ہوئی اور چور یہاں سے کچھ چیزیں ضرور لے گئے کیونکہ دونوں لڑکیاں چوروں کو کچھ ساتھ لیجاتے دیکھنا بیان کرتی ہین اور وہ ضرور کچھ لے گئے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہو کہ کوئی چیز کم بھی نہیں ہوئی ہو، کیونکہ مسٹر سُہراب جی بڑے وثوق کے ساتھ بعد تحقیقات تمام بیان کرتے ہیں"

"تو پھر اس سے کیا نتیجہ نکلا؟"

"ان دو باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ اگر کوئی چیز چوری بھی گئی ہو اور کوئی چیز کم بھی

نہیں ہوئی تو جو چیز چوری ہوگئی ہے اُس کی جگہ اُسی قسم کی دوسری چیز بالکل ہم شکل رکھدی گئی ہے، پہلا نتیجہ یہ ہے اور جب تک غلط ثابت نہ ہو ہمیں اسکے باور نہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے"

مرزا صاحب۔ "بھئی سچ کہتے ہو! ...... میری بھی اب تو یہی رائے ہے"

مسعود "آپ خیال فرمائیے کہ اس کمرے میں ایسی کونسی چیزیں ہیں جنھیں چور لیجا سکتے ہیں۔ یہ طلائی گلدان پرانے پردے بیشک قیمتی ہیں مگر اس نفیس لیس کے کام کی نقل اُتارنا ناممکن نہیں اسلیے پردوں پر نظر نہیں گئی۔ اب دوسری عجائب روزگار چیزیں اس کمرے میں راوی ورما کی تصویریں ہیں جن کے لیے یورپ اور امریکہ کے لکھپتی بیشمار دولت صرف کرنے کے لئے تیار ہیں"

"تو اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"میری رائے یہ ہے کہ سامنے راوی ورما کی جو تصویریں ٹنگی ہیں وہ اصلی نہیں ہیں بلکہ اُن کی نقل ہیں"

"مگر یہ ممکن نہیں۔ دیکھو! وہ شکنتلا کی تصویر یہ زیبائی اور سحر کسی دوسرے نقاش کے برش میں کب آسکتا ہے"

"مرزا صاحب! آپ یقین کیجئے۔ اسمیں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے نقل واقعی اچھی اُتاری ہے۔ پار سال ایک شخص ہریشچندر نامی مسٹر ٹیگور کے شاگرد کا بہانہ کرکے سہراب جی سے ملا اور راوی ورما کی تصاویر کی نقل اُتارنے کی اجازت حاصل کرلی۔ یہ شخص کئی مہینے تک ہر روز یہاں آتا رہا اور تمام دن ان تصاویر کی نقل میں صرف کرتا تھا۔ اسوقت دیوار پر ہریشچندر کی تصویریں ہیں۔ اصل راوی ورما کی تصویریں چوری گئیں"

"اِس کا ثبوت ؟"

"جناب ثبوت وبوت میں کچھ نہیں جانتا نقل نقل ہے۔ مجھے تو صاف نقلی تصویر دکھائی دیتی ہے"

اب تو داروغہ شب سنگھ کی بھی آنکھیں کھل گئیں اور اس لڑکے کی باتوں کو دلچسپی سے سننے لگے۔ اتنے میں مرزا صاحب نے کہا مسٹر سہراب جی سے کیوں نہ پوچھا جائے۔"

ذوالفقار حسین "جی ہاں اِسکی نسبت وہ صحیح رائے دے سکتے ہیں"

سہراب جی ملاقات کے کمرے میں بلوائے گئے۔ ایسے تجربہ کار افسروں کو حیرت میں ڈالنا مسعود کے لئے کچھ کم کامیابی کی بات نہ تھی لیکن اُسپر فخر کرنے کے بجائے مسعود نیچی نظریں کئے سہراب جی کا انتظار کر رہا تھا۔ کبھی کبھی کن انکھیوں سے پولیس افسروں کی طرف دیکھکر دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا۔ مسٹر سہراب جی بھی آپہونچے۔

مرزا صاحب "مسٹر سہراب جی، ہمنے آپکو اسلئے تکلیف دی ہے کہ آپ اپنے نتیجہ تفتیش کے متعلق بتا دیں۔ کیا آپ کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ چور آپ کی تصویریں چرانے آئے ہوں یا کم از کم تصویریں بدلنے کے لئے۔ یہ بات ہم پورے وثوق اور یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کیا آپ مہربانی کرکے ان تصویروں کو غور سے دیکھ کر ہمیں بتائیں گے کہ یہ اصل ہیں یا نقل"

مسٹر سہراب جی کے چہرے سے قدرے پریشانی کا اظہار ہوا مگر نہایت بے تکلفی سے کہنے لگے "کیا اچھا ہوتا کہ اسکا انکشاف نہ ہوتا مگر اب تو معلوم ہی ہوگیا۔ چھپانے سے کیا فائدہ بے شک یہ چاروں تصویریں نقلی ہیں"

"تو آپ کو اس کا پہلے ہی سے علم تھا؟"

"جی ہاں"

"پھر آپ نے ہم سے کیوں نہ بیان کیا؟"

"مرزا صاحب، ایسے عجیب و غریب ذخیرہ کا مالک یہ کب پسند کرسکتا ہے کہ دنیا کو علم ہو کہ اسکے پاس نقلی مال ہے۔"

"لیکن بغیر اسکے بتائے اصل تصویروں کے ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔"

"جی نہیں! میرے نزدیک ایک اور طریقہ اُنکی واپسی کا تھا۔"

"وہ کون طریقہ ہے؟"

"وہ یہ کہ راز کو مخفی رکھا جائے۔ اور چوروں کو بھڑکایا نہ جائے بلکہ نقدی کے عوض انھیں واپس لیا جائے۔ ان نایاب اور مشہور و معروف تصاویر کا بیچنا سہل نہیں ہے۔ اس لئے چور نقد روپیہ لینا زیادہ پسند کرینگے۔"

"لیکن چوروں سے بات چیت کیونکر کیجئے گا۔ اور کس طرح سودا چکائیے گا۔"

چونکہ مسٹر سہراب جی نے اسکا جواب ہی نہ دیا میاں معوقؔ نے فوراً کہا "مرزا صاحب کیا آپ نے انیس ہند اور غمگسار اخباروں کے اشتہاری کالم نہیں دیکھے۔ کل کے انیس میں یہ درج تھا "سوداگر تصویریں واپس لینے کے لئے تیار ہے۔"

سہراب جی مسکرائے اور معوق کے بیان سے اتفاق کیا۔ مرزا صاحب نے بڑے جوش میں آکے کہا "واقعی صاحب تمہارا خیال ٹھیک نکلا، تمھارے ہم مکتب لڑکوں کی نیز میر ولایت حسین صاحب کی رائے تمھاری نسبت بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ واللہ! کیا ذہن رسا پایا ہے اور کیسی غضب کی قوتِ مشاہدہ ملی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو شب سنگھ اور ہمارے لئے کوئی کام باقی نہ رہے گا۔"

"مرزا صاحب یہ آپکی عنایت ہے جو ایسا خیال فرماتے ہیں، مگر میں نے کیا ہی کیا ہے

یہ بات تو بہ نسبت اوروں کے بہت آسان تھی۔"

"آخاہ! تو یہ کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ ہاں اب یاد آیا! تم یہ بھی کہتے تھے کہ قاتل کا نام بتا سکتے ہو۔"

"جی ہاں، میں قاتل کو جانتا ہوں۔"

"اچھا تو جلد بتاؤ غریب جہانگیر کو کس نے قتل کیا اور کس وجہ سے اور قاتل چھپا کہاں ہے؟"

"کوتوال صاحب! آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ چوروں نے جہانگیر کو قتل کیا ہے۔ جہانگیر کا قاتل دوسرا ہے۔"

"یہ کیا کہتے ہو؟ کیا جس آدمی نے سہراب جی کو گھونسا مار کر بیہوش کر دیا اور جس آدمی کو باہر جاتے ہوئے دونوں لڑکیوں نے دیکھا اور جس کو فیروزہ بائی نے بندوق سے زخمی کیا اور جس کی تلاش میں ہم کئی روز سے سرگرداں ہیں، وہ قاتل نہیں ہے؟ کوئی دوسرا ہے؟"

"جی ہاں۔"

تو پھر کیا تم نے کسی دوسرے شخص کا آنا یہاں معلوم کیا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"پھر تمہارا کیا مطلب ہے۔ آخر جہانگیر کا قاتل کون ہے؟"

"جہانگیر کا قاتل؟ . . . لیکن قبل اسکے کہ میں نام بتاؤں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ میں اس نتیجے پر کس طرح پہونچا ورنہ آپ میری بات کا یقین نہ کرینگے اور مذاق سمجھیں گے ہم نے اس طرف کچھ توجہ نہ کی کہ آخر اس کی کیا وجہ تھی کہ صبح چار بجے تک مسٹر جہانگیر پورا سوٹ، واسکٹ، کالر اور ٹائی کیوں لگائے رہا اور بھاری بوٹ کیوں پہنے رہا۔"

مرزا صاحب۔ "میں نے اس طرف خیال دوڑایا تھا مگر سہراب جی نے کہا کہ وہ اکثر

راتوں کو دیر تک لکھا پڑھا کرتا تھا۔"

مسعود "لیکن نوکروں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جہانگیر بہت سویرے سو جاتا تھا، اگر اتفاق سے اس رات کام کر رہا تھا تو اُسے بستر اُلٹ پلٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی جس سے معلوم ہو کہ کوئی بستر پر سویا ہے۔ پہلے دن جب آپ سہراب جی کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے مَیں چُپکے سے جہانگیر کے کمرے میں گیا، اُس کی سلیپر پلنگ کے نیچے رکھے تھے۔ پھر جہانگیر نے بجائے موٹا بوٹ پہننے کے رات کو کام کرتے وقت نرم اور آرام دہ سلیپر کیوں نہ پہنے؟"

"بھئی میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"جی ہاں۔ اول میری بھی یہی کیفیت ہوئی تھی لیکن جب مجھے معلوم ہو گیا کہ ہرشچندر مصوّر کی تقریبِ مُلاقات سہراب جی سے خود جہانگیر نے کرائی تھی، یہ سب باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ اس سے میں نے قیاس کیا کہ ہرشچندر اور جہانگیر دونوں سازش میں شریک تھے۔"

"میاں مسعود! تم نے اِس قیاس میں جلد بازی سے کام لیا۔"

"مرزا صاحب! معاف کیجیے میں نے جلد بازی سے کام نہیں لیا بلکہ ہر بات کے لیے ثبوت موجود ہے۔ میں نے جہانگیر کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ جو جاذب کا تختہ اُس کی میز پر تھا اُس پر اُلٹے خط میں یہ پتہ لکھا تھا۔ ب۔ م۔ صاحب ڈاکخانہ بلی ماراں، دہلی، غالباً یہ الفاظ بلاٹنگ کاغذ پر اب بھی ہونگے اور آپ کو معلوم ہے کہ دوسرے دن سب انسپکٹر شیر سنگھ کی رپورٹ سے پایا گیا کہ گاڑیبان نے ہستناپور سے اس پتہ یعنی ڈاکخانہ بلی ماراں کے ذریعہ سے ڈاکٹر کے بُلانے کا تار روانہ کیا تھا۔ اس سے ثابت ہے کہ جہانگیر چوروں سے ملا ہوا تھا اور اُن سے خط و کتابت کرتا تھا اور اُسی کی سازش سے وہ لوگ تصویریں چُرا کر لے گئے۔"

"بہت اچھا مجھے بھی اس سے اتفاق ہے۔ مگر اس سے مطلب ؟"

"اول تو یہ کہ چوروں نے جہانگیر کو قتل نہیں کیا کیونکہ وہ تو چوروں کا دوست اور مددگار تھا۔"

"اچھا پھر ؟"

"مرزا صاحب، آپ اپنی یاد کو تازہ کیجئے۔ آپ کو خیال ہوگا مسٹر سہراب جی نے پہلا فقرہ ہوش میں آنے کے بعد اپنی بیٹی سے کیا کہا تھا، رتن بائی کے بیان میں صاف درج ہے کہ سہراب جی نے کہا "میں اچھا ہوں۔ جہانگیر! کیا جہانگیر زندہ ہے چاقو، چاقو ...... کہاں ہے۔"

"اب اسکا مقابلہ آپ مسٹر سہراب جی کے بیان سے کیجئے "جیوں ہی میں آگے بڑھا ایک آدمی سامنے کے کمرے سے نکلا۔ میری کنپٹی پر اس زور سے گھونسا مارا کہ میں بیہوش ہو گیا۔ پھر مجھے خبر نہیں کہ کیا ہوا!" اس حالت میں سہراب جی کو جبکہ وہ بیہوش ہو گئے تھے کس طرح معلوم ہوا کہ جہانگیر چاقو سے زخمی کیا گیا ہے؟ اب تو آپ سمجھے کہ خود جہانگیر کے مشورہ سے چور گھر میں داخل ہوئے، جہانگیر گول کمرے میں انکے سرکار کے پاس تھا کہ جاگ ہو گئی اور جیسے ہی اس نے مسٹر سہراب جی کو آتا ہوا دیکھا، فوراً اُن پر حملہ آور ہوا لیکن سہراب جی نے جہانگیر کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا اور غصہ کی حالت میں اُسے زخمی کر دیا اور ساتھ ہی سہراب جی کی کنپٹی پر چور نے گھونسا مارا جس سے وہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ اس شخص کو لڑکیوں نے غلام گردش میں دیکھا تھا۔"

شب سنگھ اور مرزا رحیم بیگ نے پھر ایک دوسرے کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ شب سنگھ نے لمبی سانس لی اور غصہ بھری آنکھوں سے سہراب کو دیکھا

مرزا صاحب "کیوں سہراب جی کیا یہ بات صحیح ہے؟"

سُہراب جی پر سکوت طاری ہوگیا" سُہراب جی جلد بتائیے۔ کیا ہم یقین کرلیں کہ یہ فعل آپ ہی کا ہے؟"

اس پر سہراب جی نے نہایت اطمینان سے کہا" مرزا صاحب، مسعود کے بیان کا ایک ایک لفظ صحیح ہے"

مرزا صاحب (چونک کر) "تو پھر اسکی کیا وجہ ہے کہ آپ نے پولیس کو دیدہ ودانستہ دھوکہ دیا اور غلط راستہ پر لگایا۔ آپ کو حفاظت خود اختیاری کا حق حاصل تھا پھر قتل کا اقرار کرنے سے آپ نے کیوں گریز کیا؟"

سہراب جی "بیس برس سے جہانگیر میری خدمت میں تھا، مجھے اُسپر اعتماد کلی تھا اگر اُس نے لالچ یا کسی اور وجہ سے میرے ساتھ دغا کی تو میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ اسکی دغابازی کو طشت ازبام کیا جائے"

مرزا صاحب "لیکن آپ کو پولیس سے اصل واقعات چھپانے کا کوئی حق نہ تھا"

"جب تک کوئی بے گناہ آدمی میری خاموشی کی وجہ سے نہ پھنسے مجھے اختیار تھا کہ جہانگیر کے قصور کو پوشیدہ رکھوں کیونکہ موت نے اُسے کافی سزا دے دی ہے"

"لیکن سُہراب جی! اب تو سب معاملہ کھُل گیا جو کچھ اور آپ کو معلوم ہو بتا دیجیے"

"میں حاضر ہوں۔ لیجیے وہ خط جو جہانگیر نے اپنے دوستوں کو لکھے تھے یہ موجود ہیں۔ جہانگیر کے مرنے کے بعد جیب سے برآمد ہوئے ہیں"

مرزا صاحب (مسعود سے) "تمھیں اور کیا معلوم ہے"

مسعود "بس، مرزا صاحب جو کچھ جانتا تھا سب بیان کرچکا ہوں"

"لیکن زخمی آدمی کیا ہوا؟"

"مرزا صاحب اس کی نسبت جتنا آپ جانتے ہیں اسی قدر میں جانتا ہوں اس کی کھوج مقبرے کے پاس تک کی گئی ہے۔"

"ہاں، ہاں . . . لیکن اس کے دوست اُسے وہاں سے اٹھالے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اب کہاں لے جا کر رکھا ہے اور وہ سرائے اور اصطبل کہاں ہے جس کا ذکر ڈاکٹر شیرازی نے کیا ہے۔"

مسعود نے قہقہہ لگایا۔

"سرائے؟ سرائے ورائے خاک نہیں ہے یہ تو پولیس کو دھوکہ دینے کے لیے چال چلی گئی تھی۔ اور لطف تو یہ کہ پولیس بھی دھوکہ میں آگئی۔"

"لیکن ڈاکٹر شیرازی کا بیان ہے . "

"جی ہاں ڈاکٹر شیرازی کے بیان کی وجہ سے تو ہمیں اور بھی ماننا چاہیئے اُنھوں نے مریض کا کوئی مفصل حال نہیں بتایا ہے اور سرائے یا اصطبل کا ذکر چوروں کے اشارہ سے کیا ہے۔ انھیں اپنے مریض کی صحت اور سلامتی کا بہت خیال ہے اور وہ کبھی کوئی بات اپنے وعدے کے خلاف نہ کہیں گے۔ کیونکہ اُنکے نزدیک وہ لوگ بڑے من چلے ہیں۔"

"پھر زخمی آدمی کہاں گیا؟"

"گیا کہیں نہیں، وہ ابھی تک وہیں ہے جہاں فیروزہ بائی کی بندوق سے زخمی ہو کر چھپ گیا تھا۔"

"لیکن مقبرے کے آس پاس ہر طرف تلاش کیا گیا وہاں کہیں نشان تک نہیں۔"

"جناب مرزا صاحب! میری بات کا یقین کیجیے۔ سوائے وہاں کے آدم کہیں نہیں گیا!"

مرزا صاحب (اُچھل کر) "بہرام!"

بہرام کا نام لیتے ہی مرزا صاحب پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ بہرام جسکے عجیب و غریب کارناموں نے مدتوں خلقت کو عالمِ حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ کون بہرام! معمولی چور اُچکا نہیں، بلکہ چوروں کا بادشاہ! دہلی، کلکتہ اور بمبئی کے دولتمندوں سے پوچھو! کتنے ان میں سے بہرام کے باج گزار رہ چکے ہیں۔ چوری بھی کیسی ہزار دو ہزار کی نہیں بلکہ لاکھوں اور کروروں کی۔ پولیس برسوں اس شاطر عیار کی فکر میں رہی مگر بہرام کبھی ہتے نہ چڑھا۔ کچھ عرصہ ہوا بہرام یکایک غائب ہو گیا اور عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ وہ یا تو ترکِ وطن کر گیا یا کہیں مر گیا۔ داروغہ شب سنگھ کے قدم زمین پر جم کر رہ گئے۔ اُسکی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ غالباً وہ یہ سمجھتا تھا کہ بہرام اس چپہ بھر زمین میں اس طرح پھنس گیا جس طرح پنجرے میں چوہا۔ اور اب اُس کا تلاش کر لینا بالکل آسان ہے اور انعام و اکرام اور ترقی کے دروازے گویا کھُلے نظر آنے لگے۔

مسعود "داروغہ صاحب کیا آپ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہ کام بہرام کا ہی؟"

شب سنگھ "بیشک یہ کام سوائے بہرام کے اور کس کا ہو سکتا ہی۔ ہر چیز پر گویا اُسکی مُہر لگی ہوئی ہی بہرام کا طرز عمل دوسرے لوگوں سے ایسا ہی مختلف ہی جیسا ایک چہرہ دوسرے چہرے سے"

مرزا رحیم بیگ "کیا تمھاری رائے قطعی ہی"؟

"مرزا صاحب رائے کیا معنی یہ تو بالکل مسلم بات ہی۔ آپ خود غور کریں بہرام کے ساتھی ایک دوسرے سے "ب۔م" کے پتہ پر خط و کتابت کرتے ہیں۔ جہانگیر نے "ب م" کے نام خط بھیجا۔ گاڑی والے نے اُس روز "ب م" کے پتہ پر تار روانہ کیا "ب م"

سوائے بہرام کے نام کے شروع اور اخیر حرف کے اور کچھ نہیں۔"

شب سنگھ "آخاہ! تمھاری نظر ہر چیز پر پڑتی ہی۔ بھئی، میں اب بالکل قائل ہو گیا۔ لاؤ ہاتھ! میں تمھارے سامنے کان پکڑتا ہوں۔"

مسعود کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہو گیا اور نہایت گرمجوشی سے شب سنگھ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا اور بڑی انکساری سے کہا "یہ سب غور سے دیکھنے کا نتیجہ ہی۔ آپ بھی میری طرح غور و مُشاہدہ کریں تو یہ سب باتیں معلوم کرلیں۔"

مرزا صاحب "تو تمھاری رائے میں بہرام اس مقبرے کے آس پاس کہیں ہی؟"

مسعود (اُنگلی سے اشارہ کرکے) "بہرام سوائے وہاں کے کہیں نہیں گیا۔ اگر جاتا تو فیروزہ بائی اور ان کے نوکر دیکھ لیتے۔"

"لیکن اس کا ثبوت؟"

"ثبوت یہ ہی کہ دوسرے ہی دن اُس کا ایک آدمی گاڑی بان کے بھیس میں یہاں آیا اور نہ صرف ٹوپی بدل لے گیا بلکہ اپنے سردار کی نازک حالت سے بھی واقف ہو گیا، غالبًا وہ چھپنے کی جگہ سے واقف تھا اور اُسی کے ساتھ جوش اور غصہ کی حالت میں اُس نے یہ نادانی کی کہ کاغذ کے پرزے پر بطور تنبیہ لکھ گیا کہ اگر سردار مر گیا تو فیروزہ بائی کی خیر نہیں۔"

مرزا صاحب "لیکن دوسری رات کو اُسکے ساتھی بہرام کو اُٹھا لے گئے۔"

"لیکن وے کب گئے؟ پولیس کا پہرہ یہاں برابر قائم ہی۔ وے بھی گئے ہونگے تو سَو دو سَو قدم سے زیادہ نہیں کیونکہ اس نازک حالت مین مریض کو حرکت دینا کیسے گوارا ہو سکتا ہی، میری قطعی رائے ہی کہ وہ یہیں کہیں ہی۔ ڈاکٹر شیرازی بھی مریض کو دیکھنے

یہیں آئے اور پولیس والوں کو بچوں کی طرح آگ کی طرف متوجہ کر دینا معمولی بات تھی۔"

لیکن بے آب و دانہ وہ زندہ کیسے رہ سکتا ہے؟"

"یہ میں نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ وہ یہاں سے نہیں گیا۔ وہ یہیں ہے یہیں۔ وہ دیکھو سامنے!"

یہ الفاظ مسعود نے اس سنجیدگی اور سرگرمی سے کہے کہ سب خاموش ہو گئے پھر بہرام جیسے مشہور شاطر چور کی بے بسی کا خیال کر کے مرزا صاحب نے دبی ہوئی زبان سے کہا "اگر مر جائے تو کیا ہوگا؟"

مسعود۔ "اگر بہرام مر گیا اور اُسکے دوستوں کو اُسکی موت کا یقین ہو گیا تو مرزا صاحب فیروزہ بائی کی خیر نہیں۔ جو کچھ آپ سے ہو سکے اُس کی حفاظت کا بندوبست کیجئے گا۔ بہرام کے دوستوں کا انتقام بہت خوفناک ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد مسعود حسن رخصت ہوا۔ مرزا صاحب نے اصرار بھی کیا لیکن اسکی چھٹیوں کا یہ آخری دن تھا۔ شام کی گاڑی سے سوار ہو کر علی گڑھ پہونچ گیا۔

شب سنگھ نے ایک مرتبہ پھر مقبرہ کے آس پاس کی زمین میں بہرام کا کھوج لگایا مگر محنت رائگاں گئی آخر کار مایوس و مجبور ہو کر گھر واپس گیا نوکر نے ایک خط دیا جس کا یہ مضمون تھا:۔

"کنور صاحب، تسلیم۔

کل شام علی گڑھ روانہ ہونے سے پہلے مجھے کچھ وقت ملا جسے میں نے نور محل کے مقدمہ کے متعلق مزید حالات دریافت کرنے میں صرف کیا۔ چونکہ آپ کو اس مقدمہ سے

بہت دلچسپی ہے اس لیے اطلاع دیتا ہوں :-

بہرام شہر دہلی میں آغا مرزا کے نام سے دس بارہ مہینے سے رہتا تھا۔ اگر آپ خیال کریں تو گزشتہ سال کے پبلک جلسوں اور مشاعروں میں اس نام کا تذکرہ بار بار ملیگا۔ دراصل بہرام کچھ دنوں کے لیے شیر اور شتر مرغ کا شکار کھیلنے چلا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی تجارتی کام کرتا ہے اور ضرورتاً دوسرے ممالک میں چلا جایا کرتا ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ آغا مرزا یعنی بہرام کس قسم کا کام کرتا ہے۔ دہلی میں اسکا قیام حسین خاں کی گلی میں نمبر ۳۲ کے وسیع اور پُرفضا مکان میں تھا۔ یہ مکان اُس نے اس بہانہ سے کرایہ پر لیا تھا کہ حکیم حاذق الملک سے علاج کرانے آیا ہے۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ حسین خاں کی گلی ڈاک خانہ بلی ماراں سے کچھ دور نہیں ہے جس روز سے نور محل کا واقعہ ہوا ہے۔ آغا مرزا کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ اس مکان کے معلوم کرنے میں مجھے زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ قبل اس کے کہ گاڑی والا اصلی ٹوپی اُڑا کرلے گیا میں نے ٹوپی پر دوکاندار کا نام پڑھ لیا تھا اور اس ذریعہ سے خریدار اور اُسکی سکونت کا پتہ لگایا تھا اب میری ریل چھوٹنے کا وقت قریب ہے اور آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

آپ کا نیاز مند

مسعود

دوسرے دن صبح کو شب سنگھ بلی ماراں میں مکان نمبر ۳۲ کی تلاش میں گیا۔ مکان کے قریب ایک بوڑھی خادمہ رہتی تھی اس سے معلوم ہوا کہ آغا مرزا پانچ چھ روز سے کہیں باہر چلے گئے ہیں چار روز ہوئے دو تین آدمی یہاں آئے اور تھوڑی دیر مکان میں قیام کرکے چلے گئے۔ پھر کوئی یہاں نہیں آیا۔ شب سنگھ نے مکان کھلوا کر

دیکھا تو نہایت پرتکلف فرش فروش سے آراستہ پایا لیکن آدمی کوئی نہیں تھا۔ ایک کمرہ کی انگیٹھی میں سے جلے ہوئے کاغذوں کی راکھ پائی اس سے معلوم ہوا کہ آغا مرزا کے دوست یہاں آکر مشتبہ کاغذات جلا گئے۔ مکان سے باہر آیا تو چٹھی رساں ملا جس نے آغا مرزا کے نام کا ایک خط دیا۔ شب سنگھ نے یہ خط مرزا رحیم بیگ کے سامنے پیش کیا اس پر بمبئی کی مُہر تھی مضمون حسب ذیل تھا۔

"جناب من۔ تسلیم۔

بذریعہ اس تحریر کے مَیں اُس جواب کی تصدیق کرتا ہوں جو میں نے آپ کے ایجنٹ کو زبانی دیا ہی۔ اگر آپ کو مسٹر سہراب جی کے مکان سے راوی ورما کی چاروں تصویریں مل جائیں تو طے شدہ طریقے پر روانہ کر دیجئے۔ اگر دوسری چیزیں بھی ملجائیں تو وہ بھی بھیجدیجئے لیکن مجھے یقین نہیں کہ آپ ان کے حاصل کرنے میں کامیاب ہونگے۔ مَیں ایک ضروری کام سے دہلی آرہا ہوں اور اس خط کے ساتھ ہی میں بھی دہلی پہونچونگا اور میڈن ہوٹل میں مقیم ہونگا۔ اُمید ہی کہ آپ سے ملاقات کی مسرت حاصل ہوگی۔

خاکسار

دادا بھائی"

دوسرے دن شب سنگھ نے میڈن ہوٹل جاکر دادا بھائی کو گرفتار کر لیا اور حوالات میں بھیجدیا۔ دادا بھائی نے باوجود سخت کوشش کے کچھ بیان نہیں کیا اور سوائے ایک بنڈل بڑی قیمت کے نوٹوں اور چیک بُک کے اُسکے پاس کوئی کاغذ نہ نکلا جس سے بہرام کی سازش کا حال معلوم ہوتا۔

بظاہر افسران پولیس بڑے خوش تھے کہ ایک سترہ سالہ طالب علم کی خداداد ذہانت

اور قوت مشاہدہ کی امداد سے مقدمہ کے تمام حالات دریافت کرلیے۔ قاتل پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔ بہرام کے رہنے کی جگہ بھی معلوم ہو گئی اب صرف وہ جگہ معلوم کرنا باقی تھی جہاں بہرام زخمی اور لاچار بے یار و مددگار موت کا انتظار کر رہا تھا۔

اس خوشی میں آ کے مرزا رحیم بیگ نے مقدمہ کے حالات اخبار کے رپورٹروں سے بھی کہدیے اور تمام پولیس افسران کی عادت کے خلاف جو ہر کارروائی کو فدوی کی کوشش سے منسوب کیا کرتے ہیں مرزا صاحب نے اس کامیابی کا سہرا میاں مسعود کے سر باندھا۔

دوسرے دن تمام اخباروں میں مسعود کی خداداد ذکاوت، اسکی کم سنی، صورت شکل طالب علمانہ زندگی، غرض ہر قسم کے مضامین سے کالم بھر گئے۔ مسعود سو کے اُٹھا تو اپنے گرد اپنے دوستوں کا گھمگھٹا پایا جو باصرار تمام مقدمہ کے اصل حالات پوچھتے تھے دوسرے بورڈنگ ہوسوں سے بھی جوق جوق طالب علم آنے لگے اور ممتاز بورڈنگ ہوس کا وسیع صحن پُر ہو گیا۔ پھر کچھ لڑکوں نے صحن میں ایک میز بچھائی اور میاں مسعود کو اُٹھا کے اُس پر کھڑا کر دیا اور ہر طرف سے اصرار ہوا کہ حالات بیان کرو اس شور و شغب کو سُن کر میر ولایت حسین صاحب بھی آ گئے۔ میر صاحب کی صورت دیکھ کر میاں مسعود نے بھاگنا چاہا لیکن میر صاحب نے بخوشی اجازت دے دی۔

اب کیا تھا مسعود نے نہ صرف مقدمہ کے حالات بیان کئے بلکہ اس سلسلہ میں بہرام کے طرز عمل پر نہایت بسیط اور پر مغز تقریر کی۔ بہرام کی جو باتیں لوگوں کو معجزہ اور کرامات معلوم ہوتی تھیں مسعود نے چند مثالیں بیان کر کے اس خوبصورتی سے پردہ اُٹھایا کہ بہرام کی چالاکیاں بالکل عامیانہ معلوم ہونے لگیں اور اُس کی حیثیت معمولی چور اور جرائم پیشہ کی سی نظر آنے لگی۔

جس وقت یہ حالات اخبارات میں شائع ہوئے لوگ بہرام کے پرانے حیرت انگیز کارنامے نظر انداز کر کے میاں مسعود کی غیر معمولی قابلیت اور ذہانت پر عش عش کرنے لگے اور سب نے یکزبان ہو کر اعلان کیا کہ اگر بہرام زندہ بچ گیا اور کبھی مسعود اس کے مقابلے میں آیا تو میدان مسعود کے ہاتھ رہے گا۔

کئی دن گزر گئے لیکن مرزا رحیم بیگ اور رشب سنگھ کوئی تازہ بات معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کا کچھ پتہ نہ چلا کہ فیروزہ بائی نے مسعود کے ہم شکل جس آدمی کو پھاٹک کے پاس دیکھا تھا وہ کون تھا۔ تصویریں کہاں گئیں اور کس طرح گئیں۔ جمنا گھاٹ تک ایک موٹر کار کے جانے کا نشان ملا مگر یہ تصویریں اتنی بڑی تھیں کہ معمولی موٹر کار میں نہیں چھپ سکتی تھیں، نور محل کے باغ کو مرزا صاحب نے کئی حصوں میں تقسیم کیا اور ہر روز ایک حصہ کی نہایت غور سے تلاش ہوتی تھی لیکن مقبرہ کے آس پاس کہیں چھپنے کی جگہ کا پتہ نہ چلا جہاں بہرام غائب ہو گیا تھا۔

اِدھر پبلک کا بیحد تقاضا تھا کہ یا تو پولیس اس مقدمہ کی تکمیل کرے یا ایک بار پھر میاں مسعود کی ذہانت سے مدد لے۔ چنانچہ اخبار انیس کا ایک نامہ نگار علی گڑھ آیا اور اس سے پوچھا کہ آخر اس قدر حالات معلوم کرنے کے بعد مقدمہ کی تکمیل کیوں نہیں کی جاتی۔ لیکن مسعود کا یہ جواب تھا "جناب والا مجھے آج کل فرصت نہیں ہے چور اور اُچکوں کے معاملات سے زیادہ اہم کام دنیا میں ہیں مثلاً مجھے اپنا امتحان پاس کرنا ہے یہ سب باتیں دلچسپ سہی اور پبلک کی بے چینی بھی ایک حد تک بجا ہے لیکن خیال تو کیجئے کہ مَیں امتحان میں فیل ہو گیا تو میرے والد کیا کہیں گے؟"

نامہ نگار "اگر تم نے بہرام جیسے آدمی کو گرفتار کر کے پولیس کے حوالے کر دیا

تو تمھارے والد کیا کہیں گے؟"

"جی نہیں، معاف کیجئے۔ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے میں امتحان کی چھٹیوں میں البتہ کچھ کر سکتا ہوں۔"

"چھٹیوں کے کتنے دن باقی ہیں؟"

"میرا امتحان ۱۷۔اپریل کو ختم ہوگا۔ ۱۸۔کو میں موقعہ پر پہونچ جاؤں گا۔"

"تو ۱۸۔اپریل کو بہرام گرفتار ہو جائے گا۔"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا، مجھے ۱۸۔اپریل تک مہلت دیجئے۔"

باب ۷

فیروزہ بائی کا قتل

خلقت کو ۱۸۔ اپریل کا بڑی بے صبری سے انتظار تھا اُس دن ذہانت اور ذکاوت کا پُتلا مسعود، بہرام کو ڈھونڈھ نکالے گا۔ لیکن جو لوگ اب تک بہرام کی حیرت انگیز چالاکیوں اور کارناموں کے دل دادہ تھے کہنے لگے کہ بہرام جب تک نکل بھاگا تو کیا ہوگا؟

''لیکن پولیس بڑی سختی سے پہرہ پر مامور ہے۔ نور محل سے بچ کر نکلنا محال ہے۔''

''اور اس عرصہ میں بہرام مرگیا تو کیا ہوگا؟''

''بہرام مرگیا تو اُسکے ساتھی بڑی بے رحمی سے بدلہ لیں گے۔ ابھی تک مرا نہیں ہے کیونکہ فیروزہ بائی کو کوئی گزند نہیں پہونچا ہے۔''

آخرکار ۱۸۔ اپریل آپہونچی۔ اسٹیشن پر دو تین اخبار نویس موجود تھے جنھوں نے ساتھ چلنے کی درخواست کی لیکن مسعود نے بہ منت سب لوگوں سے کہا کہ مجھے تنہا جانے دیجئے۔ امتحان کی وجہ سے مسعود کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا ٹرین میں بیٹھتے ہی سو گیا۔ خورجہ کے اسٹیشن پر آنکھ کھُلی تو سامنے کھڑکی کے پاس ایک ٹکڑا کاغذ کا پن سے آویزاں پایا اس پر موٹے حروف میں لکھا تھا۔

''ہر شخص کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہئیے۔ اگر تم دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑاؤ گے تو اچھا نہ ہوگا۔''

مسعود (خوشی میں آکے) "بہت خوب! معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کا حال تپلا ہے، کیا بیہودہ اور بے کار دھمکی ہے۔ یہ بھی گاڑی والے کی سی دھمکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے بہرام ابھی تک بیمار ہے اور یہ کام اُس کے اناڑی شاگردوں کا ہے۔"

تھوڑی دیر میں غازی آباد آگیا اور مسعود ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ اخبار فروش کی دوکان سے تازہ پرچہ انیس کا خریدا، طبلق کھولی تو ایک پرت ضمیمہ کا نیچے گر پڑا، اُس میں حسبِ ذیل مضمون تھا۔

نُور محل کا تازہ قتل

"اخبار ڈاک میں بھیجنے کے لئے تیار تھا کہ نور محل سے بذریعۂ ٹیلیفون معلوم ہوا کہ کل رات چند بدمعاش نور محل میں داخل ہوئے رتن بائی کے ہاتھ پاؤں باندھ اور منھ میں کپڑا ٹھونس کے ڈال گئے اور فیروزہ بائی کو لے کر غائب ہوگئے۔ احاطہ کے باہر ۵۰ قدم کے فاصلہ پر خون کے نشانات پائے گئے اور وہیں ایک دُلائی اور ایک ریشمی رومال بھی ملا جو خون میں تربتر تھا۔ یقین کیا جاتا ہے کہ بیچاری فیروزہ بائی قتل کردی گئی۔"

مسعود دم بخود رہ گیا اور دہلی تک بالکل خاموش بیٹھا رہا، گاڑی پر سوار ہو سیدھا نور محل پہونچا جہاں مرزا رحیم بیگ نے انیس کی خبر کی تصدیق کی۔

"کچھ اَور حالات معلوم ہوئے؟"

"کچھ نہیں مَیں ابھی آیا ہوں"

داروغہ شب سنگھ آیا اور مرزا صاحب کو کاغذ کا ایک چھوٹا سا پھٹا ہوا زردی مائل

پُرزہ دیا اور کہا کہ یہ تعویذ بھی وہیں ملا ہی جہاں ریشمی رومال - مرزا صاحب نے سرسری نظر سے کاغذ دیکھ کر مسعود کو دے دیا "اِس سے مقدمہ کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔"

مسعود نے بار بار اس کاغذ کو لوٹ پھیر کے دیکھا - اس پر ہندسے اور نقطے بالکل اس شکل کے بنے ہوئے تھے اور بظاہر تعویذ معلوم ہوتا تھا۔

۸۰	۱۰	۲۰۰	۶	۷
۲	۱۰	۲۰	۴۰	۰
۱	۲	۱	۴	۰
۰	۰	۳	۱	۵

۶۱۸ + ۱۰۰

⊙ ۳ ۵۲ ⊙ ۵۹ ⊞ ۳۳ ▭ ۲۷۸۲ ۵ھ

شام کو چھہ بجے کے قریب مرزا رحیم بیگ نے تفتیش سے فراغت پائی اور اپنے پیشدست سالک رام سے پوچھا "کچھ معلوم ہی مسعود آج تمام دن کہاں رہا؟"

"حضور مجھے کچھ معلوم نہیں ہی۔"

"آخر ہی کہاں! اُسوقت سے پھر نظر ہی نہیں آیا؟"

پھر کچھ سوچ کر اپنے کاغذوں کا بستہ سالک رام کو دیا اور جلد جلد مقبرہ کی طرف روانہ ہوا - مقبرہ کے قریب ایک درخت کے نیچے مسعود کو زمین پر بیٹھ کے بکِ پڑا پایا -

"ارے میاں کیا حال ہی، کیا سو رہے ہو؟"

"جی نہیں۔ مَیں کچھ سوچ رہا تھا"

"صبح سے اس وقت تک؟"

"جی ہاں"

"سوچنے کا یہ کون موقع ہے۔ پہلے تو اِدھر اُدھر دیکھنا، چلنا پھرنا، لوگوں سے حال پوچھنا اور واقعات معلوم کرنا اور سُراغ لگانا چاہیئے اسکے بعد سوچنے، غور کرنے اور واقعات سے نتیجہ نکالنے کا وقت آتا ہے"

مسعود "جی ہاں مجھے معلوم ہے۔ پولیس کا یہی دستور ہے، لیکن میرا طریقہ اس سے مختلف ہے۔ میں پہلے غور کرتا ہوں تاکہ مقدمہ کا خاکہ سمجھ میں آجائے پھر واقعات کی چولیں اس ڈھانچہ کے مطابق بٹھانے کی کوشش کرتا ہوں"

"یہ عجیب انوکھا طریقہ ہے"

"جی ہاں، انوکھا سہی، مگر ہے تیر بہدف۔ صرف واقعات معلومہ کی بنا پر کام کرنا اور نتیجہ نکالنا معمولی جرائم پیشوں کے مُقابلہ میں چنداں بُرا نہیں ہے لیکن جب ہمارا مدِ مقابل بہرام جیسا شاطر اور منچلا آدمی ہو تو صرف واقعات کی بنا پر کام کرنا ناکامیابی کے تاریک گڑھے میں گرنا ہے۔ بہرام جیسا آدمی اپنی چالاکی اور دانشمندی کے ذریعہ سے صدہا واقعات ہمارے سامنے ایسے بنا کر کھڑے کر دیگا جن پر عمل کرنے سے اُلٹے راستہ پڑ جائیں گے اور ہمیشہ دھوکہ کھائیں گے۔ آپ خود یاد کریں کہ بہرام نے کیسے کیسے لائق اور تجربہ کار افسروں کو مصنوعی واقعات کی بنا پر شرمندہ اور شرمسار کیا ہے اور اہل پولیس کی ناکامیابی کی یہی وجہ ہے کہ وہ ظاہری اور سطحی باتوں کو دیکھ کر نتیجہ نکال لیتے ہیں اور بہرام جیسا آدمی اُنہیں

اُنگلیوں پر نچاتا ہے۔"

مرزا صاحب "لیکن یہ کیسے سمجھ لیا کہ یہ فعل بہرام کا ہے، بہرام تو کبھی کا مر گیا اور سال بھر سے اُس کا کچھ حال نہیں معلوم ہوا ہے۔"

"لیکن ایسے زبردست اُستاد کے شاگرد بھی کیا کچھ کم ہیں؟"

مرزا صاحب نے یکایک مسعود کی کمر میں ہاتھ ڈال لیا اور کچھ دور خاموشی کے ساتھ ٹہلتے ٹہلتے چلے گئے اور سرگرمی کے ساتھ کہنے لگے۔

"میاں مسعود اِن باتوں سے کچھ فائدہ نہیں۔ اصل کام مقدمہ کا تکمیل تک پہونچانا ہے اور اب زیادہ انتظار کی گنجائش نہیں۔ خفیہ پولیس کے انسپکٹر وقار حسین ایک دوسرے مقدمہ میں مصروف ہیں اور آٹھ دس دن تک اُنھیں یہاں آنے کی فرصت نہ ہوگی۔ مسٹر سہراب جی نے الٰہ آباد کے مشہور سُراغ رساں پنڈت بینی مادھو کو بذریعۂ تار بلوایا ہے اور وہ ایک ہفتہ کے بعد یہاں آ کر مقدمہ اپنے ہاتھ میں لینگے، پھر ہماری کیا خاک عزت رہ جائیگی۔ خیال کرو کہ اگر اس عرصہ میں ہم نے مقدمہ کا انکشاف کر لیا تو کس قدر سُرخ روئی کی بات ہے اور کیا لطف آئیگا کہ جب ہم بینی مادھو سے یہ کہیں گے کہ آپ کے تکلیف کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی مقدمہ ختم ہوگیا۔"

مسعود نے مسکرا کے کہا "بہت بہتر جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے میں حاضر ہوں لیکن یہ تو بتائیے کہ فیروزہ بائی کس طرح غائب ہوئی۔"

"کل رات گیارہ بجے کے قریب اُن سپاہیوں کو جو نور محل پر شب و روز پہرہ دیتے تھے داروغہ شیر سنگھ کا ایک تحریری حکم ملا کہ فوراً تھانہ واپس آؤ نہایت ضروری کام ہے، سپاہی جس قدر جلد ہو سکا تھانہ چلے گئے۔"

"اور وہاں جا کر انھیں معلوم ہوا کہ حکم جعلی تھا اور انھیں موقعہ سے ہٹانا مقصود تھا تھوڑی دیر بعد وہ پھر لوٹ آئے ہونگے"

"ہاں داروغہ شیر سنگھ اِن کے ساتھ واپس آیا لیکن اس میں دو گھنٹے کے قریب صرف ہوگئے اور بدمعاش اپنا کام کر گئے۔ باغ سے ایک سیڑھی لائے جسے لگا کر مکان کی دوسری منزل پر چڑھ گئے فیروزہ بائی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر لے جانا چاہتے تھے کہ رتن بائی کی آنکھ کھُل گئی ابھی آواز دینے بھی نہ پائی تھی کہ بدمعاشوں نے اُس کے مُنھ میں کپڑا اٹھونس دیا اور ہاتھ پاؤں باندھ کے چارپائی سے کس دیا۔ رتن بائی نے دو آدمیوں کو فیروزہ بائی کو نیچے لے جاتے دیکھا پھر خوف کے مارے بیہوش ہوگئی اور کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا؟"

"لیکن کُتّے کہاں چلے گئے تھے۔ کچھ عرصہ سے سہراب جی نے کُتّے منگا رکھے تھے جو رات بھر چھُٹے رہتے تھے، ایسے خوفناک اور ہوشیار کتوں نے چوروں کو آنے کیسے دیا؟"

"کتے صبح کو زہر سے مرے پائے گئے"

"لیکن آخر زہر کس نے دیا! کتوں کے پاس تو پہونچنا ہی مشکل تھا"

"یہ سب معمّہ ہے۔ صرف اتنا پتہ لگا ہے کہ چور فیروزہ بائی کو مقبرہ کی طرف لے گئے اور وہاں سے اس چھوٹے پھاٹک میں ہوکر باہر چلے گئے۔ یہاں سے نصف میل کے فاصلہ پر پُرانے برگد کے نیچے کمبختوں نے فیروزہ بائی کو قتل کیا ہوگا کیونکہ یہاں بہت سا خون اور فیروزہ بائی کی دُولائی اور وہ بھی خون میں آلودہ پائی گئی"

مسعود "اگر یہ لوگ فیروزہ بائی کو قتل کرنے کی نیّت سے آئے تھے تو سونے کے کمرہ میں کیوں نہ مار ڈالا"

"شاید اُنھوں نے مار ڈالنے کا ارادہ یہاں سے باہر لیجانے کے بعد کیا ہوگا۔ میری رائے میں ریشمی رومال مُنھ میں ٹھونس دیا گیا ہوگا اور فیروزہ بائی کو دولائی میں باندھ کے یہاں سے لے گئے ہونگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قتل برگد کے نیچے کی گئی۔ یہ سب باتیں قریب قریب پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہیں"

"لیکن لاش کیا ہوئی؟"

"لاش ابھی نہیں ملی اور اس کا ملنا تعجب خیز نہیں ہے۔ جمنا کے کنارے تک کھوج ملا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدمعاشوں نے لاش دریا میں ڈال دی وہ ایک دو روز میں کہیں نہ کہیں دستیاب ہوجائے گی"

"جی ہاں بظاہر یہ سب باتیں صاف معلوم ہوتی ہیں"

"بیشک ان کی بابت کوئی شک وشبہ باقی نہیں ہے۔ بہرام مرگیا اور بدلہ لینے کے لئے اس کے ساتھیوں نے فیروزہ بائی کو قتل کرڈالا۔ اس سے زیادہ صاف اور کیا ہوسکتا ہے"

"لیکن بہرام کہاں گیا؟"

"بہرام؟ میرا قیاس یہ ہے کہ جس وقت بہرام کے دوست فیروزہ بائی کو لے گئے وہ اُسی وقت بہرام کی لاش بھی نکال لے گئے لیکن اس کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں، کیونکہ ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ بہرام یہاں کہاں چھپا ہوا تھا، میاں مسعود! یہ ایک معمہ ہے اور فیروزہ بائی کے قتل سے اس کے حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ سوال یہ ہے کہ پچھلے دو مہینوں سے نور محل میں یکے بعد دیگرے جو واقعات ہورہے ہیں اس سے کیا مطلب ہے اگر ہم اس معمے کو حل نہیں کرسکتے ہیں تو باہر کے

لوگ حل کر ڈالیں گے اور ہماری بڑی ذلت ہوگی۔"

"اور انسپکٹر بینی مادھو آئیں گے کس دن؟"

"شاید اگلے بدھ یا منگل کو۔"

مسعود (کچھ سوچ کر) "مرزا صاحب آج جمعہ کا دن ہے اور مجھے اتوار کی شام کو علی گڑھ واپس جانا ہے اس عرصہ میں امید ہے کہ کچھ کارروائی ہو سکے گی۔ کیا آپ اتوار کو دس بجے تکلیف گوارا کر کے یہاں تشریف لائیں گے۔"

مرزا صاحب (خوشی سے اچھل کر) "کیا واقعی پتا چلا لوگے؟"

"امید تو ایسی ہی کرتا ہوں۔"

"لیکن جاتے کہاں ہو؟"

"میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ جو نقشہ میں نے اپنے خیال میں قائم کیا ہے اس میں واقعات کی چول بیٹھتی ہے یا نہیں۔"

"اور اگر چول نہ بیٹھی۔"

مسعود (ہنس کر) "جو واقعات ابتک معلوم ہوئے ہیں انکی چول نہ بیٹھی تو مجھے زنجیر کی دوسری کڑیاں تلاش کرنا پڑینگی اب میں آپ سے پرسوں ملونگا۔ تسلیم۔"

مرزا صاحب خوش خوش اپنے گھر چلے گئے۔

مسعود نے سہراب جی سے ایک بائیسکل لی اور دریا کی طرف چل دیا۔

باب ۸

بہرام کی لاش

مسعود کو اس وقت یہ فکر تھی کہ اتنی بڑی بڑی چوکھٹے دار تصویریں کہاں چھپائی گئی ہونگی۔ اگر اُن کا ملنا سردست مشکل ہے تو یہ معلوم کرنا کہ چور کس راستے سے انھیں لے گئے مشکل نہ ہونا چاہئے۔ اگر موٹر کار جسمیں تصویریں گئیں شاہدرہ کے پُل پر سے جاتی تو پولیس کو اب تک معلوم ہوگیا ہوتا۔ کیونکہ وہاں کثرت سے آمدورفت رہتی ہے اور ایسے شاطر بدمعاش ایسی قیمتی اور بھاری بھرکم چیزوں کو عام گزرگاہ سے جہاں راز افشا ہونے اور پکڑے جانے کا اندیشہ ہے، نہ لے گئے ہونگے۔ اس لئے وہ کسی دوسرے گھاٹ سے لے گئے ہونگے۔ میلوں چلنے کے بعد ایک گھاٹ ملا جہاں صرف ایک کشتی تھی۔ رات کو مسعود قریب کے گاؤں میں سو رہا اور صبح کو لوگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ فروری کے مہینے میں کوئی موٹر کار کشتی پر اُتاری گئی ہے مگر کچھ پتہ نہ چلا آخر کار گاؤں کے مکھیا سے اتنا معلوم ہوا کہ ۱۳۔ فروری کی صبح کو بہت سویرے کچھ اسباب ایک بیل گاڑی پر لد کر آیا مگر بیل گاڑی دریا کے پار نہیں گئی۔

"تو کیا ہوئی؟"

"گھاٹ سے کچھ دور ایک لمبی کشتی کھڑی تھی اس پر اسباب لاد دیا گیا اور گاڑی واپس چلی گئی"۔

"اور گاڑی کس کی تھی؟"

"متھرا پرشاد کی۔"

"اور وہ کہاں رہتا ہے؟"

"بھوج پور میں۔"

پتہ دریافت کرکے مسعود فوراً بھوج پور روانہ ہوا شام کے چھ بجے سے پہلے متھرا پرشاد کا پتہ نہ چلا۔ متھرا پرشاد بڑا چالاک آدمی تھا اور پولیس کی پوچھ گچھ سے اپنے آپ کو دور رکھتا تھا لیکن جو ہیں مسعود نے چار پانچ گول گول سفید روپئے جیب سے چھنکائے، متھرا پرشاد نرم پڑ گیا اور کہنے لگا۔

"پھونیو کاٹ والوں نے مجھے چوراہے پر ملنے کو کہا تھا سورج نکلنے سے پہلے بھونیو کاٹ آئی اور انھوں نے چار بڑی بڑی چیزیں، گھاٹ سے بھی بڑی، میری گاڑی پر لادویں، مَیں اُنھیں جمنا کے کنارے لادلایا وہاں کشتی پر رکھ کر ایک آدمی لے گیا۔"

"تم اُن آدمیوں کو پہلے سے جانتے تھے؟"

"جی ہاں۔ پانچ چھہ دفعہ پہلے بھی میری گاڑی اُنھوں نے کرایہ کی تھی۔"

مسعود (چونک کر) "پانچ چھہ دفعہ! اس سے پہلے، اور کتنے دن پہلے کرایہ کی تھی؟"

"جس دن کا تم حال پوچھتے ہو اس سے پانچ چھہ دن پہلے ہر روز میری گاڑی کرایہ کی جاتی تھی۔ پہلی چیزیں کچھ لمبی چوڑی نہ تھیں بلکہ بھاری بھاری اور خوب کاغذوں میں لپٹی ہوئی اور بہت ڈھیر ڈھیر میری گاڑی پر رکھتے تھے کہ کہیں ٹھیس نہ لگ جائے اور مجھے تو ڈرا دیا کہ خبردار ہاتھ نہ لگانا۔ ہائیں! تم پیلے پڑے جاتے ہو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟"

"نہیں کچھ نہیں بائیسکل پر چلتے چلتے تھک گیا ہوں۔"

مسعود کی خوشی کا کچھ اندازہ نہ تھا، رات کو مکھیا کے یہاں گاؤں میں سویا اور صبح کو نور محل واپس آیا۔ یہاں آکر ایک خط ملا۔ لفافہ کھولا تو صرف ایک سطر لکھی تھی

"دوسری تنبیہ؟ خبردار ایک لفظ زبان سے نہ نکلے ورنہ . . . . "

مسعود اس دھمکی سے مطلق نہ گھبرایا اور دل میں کہنے لگا کہ اب ذرا احتیاط سے کام کرنا پڑے گا۔ ۹ بج گئے مسعود مقبرے کی طرف گیا اور ایک قبر پر اوندھا لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ دس بجے مرزا صاحب وہاں پہونچے اور مسعود کو اُٹھایا۔"

"کہو پتہ چلا؟"

مسعود "مرزا صاحب بہت کچھ۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں باوجود اس دھمکی کے جو مجھے آج اس خط کے ذریعہ سے دی گئی ہے۔"

مرزا صاحب (خط دیکھ کر اور داڑھی ہلا کر) "لاحول ولاقوۃ! مسعود کیا تم اِس لغو دھمکی سے ڈر گئے؟"

"جی نہیں میں کچھ ڈرا بھی نہیں ہوں اور دس منٹ میں اس معمہ کا ایک حصہ حل کیے دیتا ہوں۔"

مرزا صاحب (تعجب سے) "یہ ایک حصہ کیسا؟"

"حصہ اس وجہ سے کہ بہرام کے چھپنے کی جگہ معلوم کرنا اصل معاملہ کا صرف

ایک حصہ ہے۔ اس کی اور بھی شاخیں ہیں "

" مگر تمھیں معلوم کیسے ہوا؟ تم مجھے متحیر کیے دیتے ہو "

مسعود " آپ کو یاد ہوگا کہ دادا بھائی نے جو خط آغا مرزا یعنی بہرام کو بھیجا تھا اُس میں چاروں تصویروں کا ذکر کر کے یہ بھی لکھا تھا اگر دوسری چیزیں بھی مل جائیں تو وہ بھی روانہ کر دیجئے لیکن مجھے یقین نہیں "

" ہاں مجھے یاد ہے مگر اس سے مطلب؟ "

اور چیزوں سے کیا مطلب ہے؟ بظاہر اس سے نور محل کی قیمتی چیزیں مقصود ہیں مکان کے اندر جسے آپ خوب دیکھ چکے ہیں راوی ورما اور ٹیگور کی تصویروں کے علاوہ اور چیزیں کچھ زیادہ قیمتی نہیں ہیں زیور اور برتن کا خیال بالکل فضول ہے کیونکہ بمبئی کا کوئی مالدار ان چیزوں کا خواہشمند نہیں ہو سکتا اس لئے تصویروں کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی گئی ہیں۔ دادا بھائی نے اگرچہ ان چیزوں کا بہم پہونچانا مشکل سمجھا ہے لیکن بہرام اور اُس کے دوستوں کے لئے کوئی کام مشکل نہیں "

مرزا صاحب " لیکن سوائے تصویروں کے اور کوئی چیز غائب نہیں ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام کو اس میں ناکامیابی ہوئی "

مسعود " ہرگز نہیں۔ اور کچھ سامان بھی گیا ہے جس کی جگہ دوسری چیزیں اسی صورت اور شکل کی رکھ دی گئی ہیں۔ یہ تصویروں سے بھی زیادہ قابلِ قدر اور قیمتی ہیں "

" آخر بتاتے کیوں نہیں ہو۔ اس ٹال مٹول سے پریشان کئے دیتے ہو "

" بہتر "

یہ کہکر مسعود سہراب جی اور مرزا صاحب کے ساتھ مقبرہ کی طرف بڑھا اور پوچھنے لگا۔

"کیا آپ واقعی جاننا چاہتے ہیں؟"

مرزا صاحب "بیشک"

مقبرہ کے سامنے ذرا فاصلہ پر جا بجا دہلی کے بادشاہوں کے سنگین بت جنھیں سہراب جی نے بصرفِ زرِ کثیر اٹلی اور پیرس کے مشہور بُت تراشوں سے لاکھوں روپیہ دے کر تیار کرایا تھا سنگ موسیٰ کے ستونوں پر رکھے ہوئے تھے۔

مسعود "اگر آپ واقعی دریافت کرنا چاہتے ہیں تو مسٹر سہراب جی ذرا دیر کے لیے مجھے اپنی لکڑی عنایت کیجیے"

مسٹر سہراب جی کے ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا تھا مسعود نے اُسے لے کر بابر کے بُت پر اس زور سے مارا کہ بُت ٹکڑے ٹکڑے ہوکے زمین پر گر پڑا۔ اس حرکت سے مسٹر سہراب جی کے گولی سی لگی اور جس طرح کوئی شیرنی اپنے بچے کو خطرے میں دیکھ کر بپھرتی ہے مسٹر سہراب جی نے چلا کر کہا۔

"کمبخت یہ کیا کرتا ہے؟ کیا پاگل ہوگیا ہے؟"

مسعود "سہراب جی آپ گھبرایئے نہیں۔ بابر کا اصلی بُت یہ نہیں ہے اسکے ٹکڑوں کو دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سنگِ مرمر کے بجائے پلاسٹر آف پیرس کا بنا ہوا ہے اور یہ دیکھیے (اکبر کے بُت کو لکڑی سے گرا کر) "پلاسٹر کا بت بنا کر اکبر جیسے شہنشاہ کی کیسی تذلیل کی ہے"

سہراب جی اپنے نادر الوجود ذخیرہ کی تباہی اور بربادی کو نہ دیکھ سکے اور پستول نکال کر۔

"مسعود اگر تم نے کسی اور بُت پر لکڑی چلائی تو فوراً جان سے مار دونگا"

مسعود (ہنس کر) سہراب جی اِن ٹکڑوں کو ہاتھ میں لے کے غور سے دیکھیے میں آپ کے نادرالوجود بتوں کو نہیں توڑ رہا ہوں، کاغذ کی ردی کے بُت بنا کر پلاسٹر پھیر دیا ہی یقین نہ ہو تو لیجیے نادرشاہ کا بُت ملاحظہ کیجیے۔ دیکھیے پلاسٹر کے ٹکڑے کتنی دُور اُڑتے ہیں سنگِ مرمر ہوتا تو کیا اِس لکڑی کی ضرب سے ٹوٹ جاتا"

مرزا صاحب نے سُہراب جی کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور ادھر مسعود کو ایک ڈانٹ بتائی۔

مسعود" آخر آپ یقین کیوں نہیں کرتے۔ یہ دیکھیے چونے اور پلاسٹر کے ٹکڑے"

اب کی دفعہ سیواجی کا بُت بھد سے گر پڑا۔ سہراب جی نے چند ٹکڑے ہاتھ میں لے کر دیکھے تو بجائے سنگِ مرمر کے چونا اور ردی پایا۔

"ہاے افسوس! میری تمام عُمر کی محنت اور لاکھوں روپیہ کیسا برباد ہوا! مَیں تو ان بتوں کو دیکھ کر جیتا تھا اور فخر کرتا تھا کہ دنیا میں اس سے بہتر ذخیرہ کسی کے پاس نہیں ہے"

مسعود" سہراب جی مجھے آپ کے ساتھ کمال ہمدردی ہی لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے اور بھی صدمہ ہوگا کہ مقبرہ کے اندر جتنے عجیب و غریب کتبے اور آثار قدیمہ کے قیمتی نمونے تھے وہ بھی غائب ہوگئے"

سہراب جی (اُچھل کر)" یہ کیسے ہوسکتا ہی۔ مقبرہ ہر وقت مقفل رہتا ہی"

"بہتر ہی کُنجی منگوائیے ابھی معلوم کئے لیتے ہیں"

ایک نوکر دوڑ کے کُنجی لایا اور مقبرہ کھولا گیا۔ مقبرہ کے وسط میں ایک سنگین

چبوترہ تھا جس پر عمارت کے وقت کا ایک کتبہ رکھا تھا اور چاروں طرف
طرح طرح کے پتھر اور ہر قسم کے کتبے لگے تھے۔

مسعود۔ سہراب جی! غور سے دیکھئے یہاں آپ کو کتنی چیزیں اصلی نظر آتی
ہیں؟ بہرام بھی کیا باکمال آدمی ہے کیسی نادر الوجود چیزوں کی نقلیں بنا کے
یہاں رکھی ہیں۔ کاش [illegible] قابلیت اور حیرت انگیز تخیل کو کسی نیک
کام میں [illegible] سبقت لے جاتا۔

یہ شخص چور کا پیشہ نہ ہوتا تو [illegible] شاگردی کو اپنا فخر سمجھتا۔ واللہ کیا دماغ پایا ہے
مرزا صاحب [illegible] تو شاید جامع مسجد بھی چرا کر لیجاتا۔"
مسعود [illegible] یہ حال ہے کہ آپ کو ناک چنے چبوا رہا ہے"
مرزا صاحب [illegible] حیرت انگیز قابلیت سے انکار نہیں لیکن
[illegible] اور اس کی لاش کہاں ہے؟"
[illegible] اور کہیں نہیں گیا"

[illegible] عمارت سے خوب واقف ہو"
[illegible] آپ کو معلوم
ہوگا کہ [illegible] مذہب کا مندر اور
[illegible] مکانات میں
[illegible] چھپ جایا کرتے
تھے [illegible] ایک مندر معلوم ہوتا ہے
[illegible] بند ہوگئی ہیں غالباً

بہرام کو انمیں سے کوئی راستہ معلوم ہوگا اور وہ اس تہ خانہ میں چھپا ہوگا"

سہراب جی "لیکن میں اس مکان کے کونہ کونہ کی تاریخ سے واقف ہوں میرے نزدیک یہاں کوئی تہ خانہ نہیں ہے، علاوہ اسکے اتنے دنوں سے ہم سب ڈھونڈھ رہے ہیں کوئی نکاس کا راستہ ہوتا تو مل جاتا"

مسعود "میں نے حال ہی میں اسکی خوب تفتیش کی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ان کاغذات اور کتبوں کو پڑھئے جو ابھی نئی دہلی کی زمین صاف کرتے وقت دستیاب ہوئے ہیں۔ انکی روسے پرانے زمانہ میں ایسی ایسی جگہ تہ خانے بنائے جاتے تھے کہ لوگوں کو گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ میرا دل تو یہی کہتا ہے اور اب تک جو شہادت مرزا صاحب کے سامنے پیش ہوئی اس سے بھی یہی پایا جاتا ہے کہ بہرام سوائے یہاں کے اور کہیں نہیں گیا۔ اور جس زمانہ میں بہرام یہاں سے اصلی چیزیں ہٹانے اور انکی نقل اتارنے میں شب و روز مصروف تھا اس نے اس پوشیدہ جگہ کو معلوم کر لیا ہوگا"

مرزا صاحب۔ "تو کیا یہ بہرام کی قبر ہے؟"

مسعود "ابھی معلوم ہوا جاتا ہے"

اتنے میں آدمی کدال لے کر آیا۔ مسعود نے اول لکڑی سے فرش کو جگہ جگہ ٹھوک کے دیکھا پھر بیچ میں جو کتبہ لگا یا تھا اس پر کدال مارا پتھر نہ صرف ٹوٹ گیا بلکہ دھد سے نیچے گر پڑا کدال کے زور سے وہ پتھر بھی جس پر یہ کتبہ لگا ہوا تھا ٹوٹ گیا یہ سب سامان یکایک غائب ہو گیا اور ان پتھروں کے نیچے ایک تنگ و تاریک غار کا منھ کھل گیا۔ مسعود نے جھک کر دیکھا سرد اور مرطوب ہوا نیچے سے آئی۔ پھر مسعود نے دیا سلائی جلا کر غار میں چاروں طرف دکھائی۔

"اخاہ! میرا خیال ٹھیک تھا اس میں اُترنے کے لئے وہ سیڑھیاں بنی ہیں آخری سیڑی اس مقبرہ کی دہلی کے نیچے ہے"

"کیا تہ خانہ بہت گہرا ہے"

"کوئی تین چار گز ہوگا۔ بعض سیڑھیاں غائب بھی ہیں"

مرزا صاحب "ایسی تنگ و تاریک جگہ سے بہرام کو یا اُس کی نعش کو اُس رات نکال لے جانا جب کہ فیروزہ بائی غائب ہوئی ممکن نہیں ہو سکتا۔ میری رائے میں اسکی نعش بھی یہیں ہوگی"

نوکر باغ سے سیڑھی لے آیا اور مسعود نے سیڑھی نیچے اُتار کے مرزا صاحب سے نیچے اُترنے کے لئے کہا۔ مرزا صاحب کے بعد سہراب جی اور اُسکے بعد مسعود اُترا، لیکن ابھی آخری ڈنڈے سے پیر بھی نہ اُترا تھا کہ ایسی سخت بدبو آئی جو مسعود کو مدتوں یاد رہیگی، اتنے میں مرزا صاحب نے مسعود کے کندھے پر ہاتھ رکھکر تتلا کے "م م مسعود! م م مسعود ..." خوف کے مارے کچھ نہ کہا گیا۔

مسعود "مرزا صاحب! خدا کے واسطے آپ اپنے کو سنبھالیے۔ آخر ہے کیا بات جو آپ اس قدر سراسیمہ اور پریشان ہیں؟"

"بہرام یہاں ہے"

"کہاں؟ مجھے تو نظر نہیں آتا۔"

"نیچے اُتر کر دیکھو ... اُس پتھر تلے جو ابھی اوپر سے ٹوٹ کے گرا ہے ... میں نے پتھر ہٹا کر دیکھا تو ... آہ میں کبھی نہ بھولونگا"

"کس طرف؟"

"یہاں کیا تھیں بدبو نہیں معلوم ہوتی - یہ دیکھو یہاں"
مرزا صاحب نے سہراب جی کے ہاتھ سے روشنی لے کر ایک بے حس و حرکت جسم کے قریب کر دی
"ارے رے - رے" مسعود گھبرا کر بولا - فوراً تینوں آدمیوں نے جھک کر دیکھا نعش
نصف برہنہ تھی بالکل پوست و استخوان پھٹے ہوئے کپڑوں میں بعض جگہ سبز سبز رنگ کا گوشت
بھی دکھائی دیتا تھا لیکن جس چیز نے مسعود کو اس قدر سراسیمہ کر دیا تھا وہ گردن سے
اوپر کا حصہ تھا جو بھاری پتھر کے گرنے سے بالکل چکنا چور ہو گیا تھا اور اس طرح کچل گیا تھا
کہ دیکھ کر گھن آتی تھی - چہرہ کی کسی چیز کا شناخت کرنا ممکن نہ تھا مسعود تیزی سے سیڑھی
پر چڑھا اور فوراً کھلے میدان میں کھڑا ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگا -
مرزا صاحب تہ خانے سے برآمد ہوئے تو دیکھا کہ مسعود پیٹھ کے بل گھاس پر لیٹا ہے -
"میاں مسعود میں تمھیں مبارکباد دیتا ہوں کہ آخر کار بہرام کی پوشیدہ جگہ کو
ڈھونڈھ نکالا - علاوہ اسکے تمھارا یہ خیال صحیح ہے کہ واقعی یہ شخص بہرام تھا اور آغا مرزا
صاحب کے نام سے حسین خاں کی گلی میں رہتا تھا - اس کی قمیص کے کالر پر اے - م
لکھا ہے، یہ ثبوت بالکل کافی ہے - کیوں ؟"
مسعود بے حس و حرکت لیٹا رہا اور کچھ جواب نہ دیا -
"مسٹر سہراب جی گاڑی تیار کرانے گئے ہیں تاکہ ڈاکٹر کو معائنہ نعش کے لیے بلایا
جائے میری رائے میں اسے مرے ایک ہفتہ ہوا ہوگا کیونکہ نعش بالکل سڑ گئی ہے مسعود
سنتے ہو یا نہیں ؟ میں جو کچھ کہتا ہوں ہر ایک بات کے لئے ثبوت موجود ہے"
اس وقت مرزا صاحب اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے اور جوش میں آیا
کہنے لگے لیکن مسعود اپنے خیال میں ڈوبا ہوا تھا اور کچھ توجہ نہ کی - اتنے میں

سہراب جی ڈاکٹر سمیت آگئے۔ جیب سے نکال کے دو خط مرزا صاحب کو دیئے۔ ایک میں لکھا تھا کہ پنڈت بینی مادھو کل آئیں گے۔

مرزا صاحب (خوشی کے لہجہ میں) "پنڈت بینی مادھو یہاں خوشی سے آئیں لیکن کام تو ختم ہوگیا۔ انسپکٹر وقار حسین بھی واپس آتے ہیں۔ آکر بڑے جھینپیں گے مقدمہ کا انکشاف بخوبی ہوگیا۔ آکر کیا اپنا سر کھائیں گے؟"

مرزا صاحب (دوسرا خط پڑھ کر) "اب تو کچھ باقی نہیں رہا۔ وقار حسین اور بینی مادھو یہاں آنے کی تکلیف کیوں گوارا کرتے ہیں۔ کوتوالی میں اطلاع پہنچی ہے کہ مبارک پور کے قریب ماہی گیر مچھلیاں پکڑنے جا رہے تھے تو انھیں ایک جوان عورت کی نعش جھاڑیوں میں اٹکی ملی"

مسعود (چونک کر) "کس عمر کی لاش؟"

"وہ ایک نوجوان عورت کی ہے۔ تمام جسم پر گہرے گہرے نشان ہیں اور لاش کی حالت اس درجہ خراب ہوگئی ہے کہ شناخت کرنا ممکن نہیں۔ لاش کی داہنی کلائی پر گوشت میں اندر گھسا ہوا سونے کا ایک بالا، اور لکھا ہے ایسا کڑا فیروزہ بائی پہنا کرتی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لاش فیروزہ بائی کی ہے جو دریا میں بہتی ہوئی اتنی دور پہنچ گئی۔"

"کیوں مسعود تمھاری کیا رائے ہے؟"

مسعود "میری رائے کچھ نہیں۔ زنجیر کی تمام کڑیاں ملتی جاتی ہیں۔ ہر واقعہ سے میرے خیال کی تصدیق ہوتی ہے جو میرا شروع سے ہی خیال تھا۔"

مرزا صاحب۔ "آخر اس کہاوت سے مطلب۔ صاف کیوں نہیں کہتے؟"

"مرزا صاحب! ذرا صبر سے کام لیجیے۔ میں نے آج شام تک کا وعدہ کیا ہے اور اب تک آپ کو میری کوئی بات لغو اور فضول نہیں ثابت ہوئی۔ پس آپ مجھے شام تک کی

اور مہلت دیجئے آپ آرام سے نور محل میں بیٹھیں حقہ پئیں۔ چائے کا وقت بھی قریب ہے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے، میں چار بجے واپس آجاؤنگا اور شام کی گاڑی ملی تو رات کو علی گڑھ چلا جاؤنگا۔ کل مدرسہ کھلنے سے پہلے مجھے پہونچ جانا چاہیئے۔"

سب لوگ نور محل کی طرف آئے اور مسعود بائیسکل پر سوار ہوکر باہر چل دیا۔ میونسپلٹی کے دفتر میں کچھ کاغذات دیکھے۔ دو ایک ہوٹلوں کی وزٹیر بک پڑھی۔ نظام الدین اولیا پہونچ کر مجاوروں سے دو چار سوالات کیے۔ اتنے میں تین بج گئے اور مسعود اپنی تفتیش ختم کرکے بہت خوش خوش نور محل کی طرف روانہ ہوا۔ وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش اور اپنے خیالات میں مستغرق تھا اور زور سے بائیسکل چلا رہا تھا۔ سڑک پر ایک جگہ بہت ڈھال تھا مگر مسعود نے اپنی رفتار کم نہ کی اور سیٹی بجاتا ہوا مگن چلا جا رہا تھا یکایک اُسنے اپنے سامنے ایک رسی دیکھی لیکن اسقدر قریب تھی کہ بریک لگانے بھی نہ پایا تھا کہ بائیسکل رک گئی اور مسعود تین چار گز کے فاصلے پر بڑے زور سے جاگرا، گھٹنے کنکر سے کٹ گئے، کہنیاں چھل گئیں اور گال پر بھی خراش آئی خیریت ہوئی کہ اسکا سر قریب کے پتھر سے نہیں ٹکرایا ورنہ خاتمہ ہوجاتا۔ تھوڑی دیر اس حالت میں پڑا رہا۔ پھر کپڑے جھاڑ کے اٹھا اور غور سے موقع کو دیکھنے لگا۔ سڑک کے کنارے درخت اور جھاڑیاں بکثرت تھیں غالباً رسی باندھنے والا اس طرف بھاگ گیا۔ جس درخت کی جڑ سے رسی بندھی تھی وہاں کاغذ کا ایک پرزہ پن سے آویزاں پایا۔ مسعود نے اُسے کھولا اور پڑھا۔

"تیسری اور آخری تنبیہ"

مسعود نے کاغذ لپیٹ کے جیب میں رکھا اور سیدھا نور محل پہونچا، نوکروں سے دو چار سوال کرکے مرزا صاحب کے پاس گیا۔ مسعود کو اس ہیئت کذائی میں

اور وحشت زدہ دیکھ کر مرزا صاحب نے اپنے پیش دست سالک رام کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور بیتابی سے پوچھا۔

"ہائیں! خیر ہے!! یہ کیا ماجرا ہے! کیا کسی سے لڑے ہو؟"

مسعود: "گھبرائیے نہیں۔ یہ معمولی خفیف چوٹ لگ گئی ہے۔ کسی نے یہ رسّی تان کر مجھے بائیسکل سے گرا دیا اور واضح رہے کہ یہ نور محل سے گئی ہے۔ آدھا گھنٹہ ہوا اُس پر کپڑے سُوکھ رہے تھے۔"

"کیا واقعی؟"

مرزا صاحب: "یقین کیجئے کوئی شخص یہاں میری نگرانی کر رہا ہے۔ وہ مجھے دیکھتا بھی ہے میری باتیں بھی سنتا ہے۔ تمام نقل و حرکت اور ایک حد تک میرے سلسلۂ خیالات سے بھی واقف ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے؟"

"بالکل سچ۔ آپ کوشش کرینگے تو معلوم ہو جائے گا اب وقت کم ہے اور میں حسب وعدہ آپ سے تمام راز افشا کئے دیتا ہوں۔ بدمعاشوں کو خیال بھی نہ ہوگا کہ مجھے اس قدر جلد کامیابی ہوگئی۔ مگر وہ سب حالات سے واقف ہیں اور میرے گرد حلقے کو تنگ کر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خطرہ بالکل سامنے آپہونچا۔"

مرزا صاحب: "لاحول ولا قوۃ۔ آخر ہو نہ لڑکے ڈرے جاتے ہو۔"

مسعود: "خیر دیکھا جائیگا لیکن اب وقت بہت کم ہے اور ایک نہایت اہم بات حل طلب باقی ہے۔ کیا آپ نے کسی سے اس پرزہ کاغذ کا تذکرہ کیا ہے جو داروغہ شیر سنگھ کو سرنگ کے نیچے مردہ پایا گیا اور وہ ان کے ساتھ پڑا ملا تھا؟"

مرزا صاحب: "نہیں، میں نے تو کسی سے ذکر نہیں کیا اور نہ میرے نزدیک وہ

کوئی قابلِ ذکر بات تھی۔ کیا تم اُس کاغذ کے پرزہ کو اہم چیز سمجھتے ہو؟"

"حد درجہ اہم! اگرچہ ابھی تک اُسکے پڑھنے میں کامیاب نہیں ہوا ہوں۔۔ میرے دماغ میں ایک خیال آیا اور کیا عجب کہ چول ٹھیک بیٹھ جائے۔ اور یہ معمہ حل ہو جائے، اس کے حل کرنے میں آپ کی امداد کی بھی ضرورت ہے۔ اس لیے آپ سے کہتا ہوں۔"

مرزا صاحب بولنا چاہتے تھے کہ مسعود نے اُن کا ہاتھ زور سے دبایا "خاموش رہیے دیکھئے باہر کوئی سُن رہا ہے"

باہر کسی کے چلنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ مسعود اٹھ کر کھڑکی کی طرف دوڑا اور جھک کر دیکھا مگر کسی کو نہ پایا۔

"تھا کوئی ضرور قدم کے نشان صاف بنے ہیں اس کی تفتیش صبح ہو جائیگی"

یہ کہکر کھڑکی بند کر دی اور مرزا صاحب کے پاس آ بیٹھا۔

"مرزا صاحب! اب تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ دشمن کس قدر ہماری تاک میں ہیں، وہ بھی معاملہ کی اہمیت اور سنجیدگی سے واقف ہو گیا ہے۔ بہت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ اب انھیں یہاں ذرا دیر بیٹھنا اور صلاح مشورہ کرنا بھی خطرناک معلوم ہوتا ہے"

مسعود نے کاغذ کا ٹکڑا جیب سے نکال کر میز پر رکھا

مرزا صاحب "یہ تعویذ معلوم ہوتا ہے اس سے مقدمہ سے کیا تعلق ہے؟"

"مرزا صاحب! ذرا غور سے دیکھیے۔ اس پرزہ پر تقریباً تمام ہندسے اور نقطے بنے ہیں سوائے آخری سطر کے یہ کچھ اور چند ذرا سے بھید حل ہو جائینگے۔ سرِ دست ہمیں ان ہندسوں اور نقطوں سے کام ہے۔ میں جب سے سوچ رہا تھا کہ یہ بھی کوئی تعویذ

اس طرز کا نہیں لکھا گیا۔ میں نے نظام الدین اولیاء جا کر وہاں کے معتمد مجاوروں سے مشورہ کیا۔ بلکہ حلقہ نظامیہ کے سرگرم اور پُرجوش نئے فیشن کے عالم خواجہ علی نظامی کو بھی یہ تحریر دکھائی اور انھوں نے بھی یہی کہا کہ یہ تعویذ نہیں ہے۔ مجھے اُنکی رائے پر پورا وثوق ہے۔ اسکے بعد میں نے غور کرنا شروع کیا۔ فرض کیجئے کہ یہ ہندسے بحساب ابجد کوئی عبارت ہے۔ شروع کی سطر ملاحظہ کیجئے۔ ۸۰-۱۰-۳۰۰-۶-۷ = ف، ی، ر، و، ز اور دوسری سطر اسی حساب سے۔ ب۔ ی، گ، م، بناتی ہے۔ ظاہر ہے کہ فیروزہ بائی مراد ہے۔ لیکن تیسری اور چوتھی سطر آبادشاہ سے کچھ مطلب نہیں نکلتا۔

۸۰	۱۰	۳۰۰	۶	۷
۲	۱۰	۲۰	۴۰	۰
۱	۲	۱	۴	۰
۰	۰	۳	۱	۵

۶۱۸ +۱۰۰

اس ۵ ۳۳ ۸ ۲ ☐ ۳۳ ⊟ ۵۹ ⊕ ۳۵۲ ◎

مرزا صاحب "ہاں ممکن تو ہے لیکن اور آگے"

مسعود۔ "ابھی میں یہیں تک پہونچا تھا کہ بائیسکل کا واقعہ پیش آیا اور میں سیدھا یہیں چلا آیا کہ آپ کی مدد سے اس معمے کو حل کروں لیکن اس حل کے ماننے میں مجھے ابھی تک شک ہے کیونکہ یہ تحریر تازہ نہیں معلوم ہوتی اگرچہ روشنائی میں چمک ہے۔ لیکن یہ کاغذ ذرا غور سے دیکھیے پرانے وقتوں کا معلوم ہوتا ہے۔ رنگت بھی زرد پڑ گئی ہے اور آج کل اس کاغذ کا رواج نہیں ہے۔"

مسعود آگے نہ کہنے پایا تھا کہ سالک رام نے دروازہ کھٹکھٹایا اور پھر اندر آکر

ڈپٹی کمشنر صاحب کی آمد کی اطلاع کی۔ مرزا صاحب فوراً کھڑے ہو گئے۔

"کیوں خیر تو ہے۔ کیا کوئی تازہ بات؟"

"حضور کچھ نہیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب پھاٹک پر گاڑی میں ہیں اور کہیں جا رہے ہیں حضور سے کوئی بات ضروری کہنا چاہتے ہیں اور آپ کو پھاٹک پر کھڑے کھڑے بلایا ہے۔"

مرزا صاحب "میاں مسعود! معاف کرنا۔ میں ابھی لوٹ کر آتا ہوں۔"

مرزا صاحب باہر گئے اور ابھی زینہ سے بھی نہ اترے تھے کہ سالگرام نے اندر سے دروازہ مقفل کر کے کنجی اپنی جیب میں رکھ لی۔

مسعود تعجب سے چلا کر "ہائیں! خیر تو ہے۔ دروازہ کیوں بند کرتے ہو؟"

سالگرام "کچھ نہیں صرف اطمینان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

مسعود سالگرام کا مطلب سمجھ گیا اور فوراً سامنے بند دروازہ کی طرف دوڑا۔ لیکن اسے باہر سے بند پایا۔

سالگرام (قہقہہ لگا کر) "اپنے ہاتھ کیوں دکھاتے ہو۔ دروازہ مضبوط ہے اور میں نے باہر سے بند کر دیا ہے۔"

"کھڑکی تو کھلی ہے۔"

مسعود ابھی کھڑکی کی طرف جست بھی نہ کرنے پایا تھا کہ سالگرام جیب سے پستول نکال کے کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

مسعود حیران تھا کہ کیا کرے ہر طرف راستہ بند تھا اور سامنے سالگرام پستول لیے ہوئے تھا اور شش و پنج [illegible] کھڑا تھا۔ آخر کار مجبور ہاتھ باندھے خاموش کھڑا ہو گیا۔

سالک رام "اب ٹھیک ہے۔ دیکھو ہمارے پاس وقت کم ہے گھڑی نکال کے
مرزا صاحب پھاٹک تک جائیں گے اور وہاں کسی ڈپٹی کمشنر کو نہ پائیں گے پھر لوٹ
آئیں گے۔ اس میں چار منٹ صرف ہو گئے۔ ایک منٹ مجھے کھڑکی سے فرار ہونے
کے لیے چاہیے تاکہ موٹر سائیکل پر جو پھاٹک کے باہر رکھی ہے سوار ہو کر چلا جاؤں
صرف تین منٹ بچتے ہیں جو بالکل کافی ہیں"
سالک رام پستہ قد موٹے دھڑ اور پتلی ٹانگوں کا ہے ہنگم آدمی تھا اگرچہ خوش
طبیعت آنکھوں سے خونخواری برستی تھی مسعود اُسے اس حالت میں دیکھ کر لرز گیا
اسوقت اُسے خطرہ کا پورا احساس تھا۔ وہ ایسے دشمن کے چنگل میں تھا جس کی تندی
اور خونخواری سے بچنا محال تھا۔ اس کے پیر کانپنے لگے اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"منہ سے بولو! تم چاہتے کیا ہو؟"

"وہ کاغذ کا پرزہ جس کی تلاش میں کئی دن سے پریشان ہوں"

"میرے پاس نہیں ہے"

"تم جھوٹ بولتے ہو میں نے تمہیں ابھی پاکٹ بک میں رکھتے دیکھا ہے"

"اسکے علاوہ اور کیا چاہتے ہو؟"

"اسکے علاوہ اور یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی زبان کو روکو ورنہ خیر نہیں۔ اب تم
ہم لوگوں کو بہت تکلیف دینے لگے ہو، ہمارے صبر کا پیالہ چھلکنے والا ہے"
یہ کہکر پستول کی نال مسعود کے سر کی طرف اٹھائے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کی
خونخوار نظریں مسعود کے دل میں تیر کی طرح چبھ رہی تھیں اسکے ہونٹوں پر تبسم تھا جس سے
وہ خونی ظاہر ہوتی تھی جو درندوں کو شکار پر حملہ کرنے کے وقت ہوتی ہے۔

"اور کیا چاہتے ہو؟"

"اور کچھ نہیں ... پھر تم بالکل آزاد ہو"

تھوڑی دیر خاموش رہا پھر سالکرام نے کہا (گھڑی دیکھ کر) "اب صرف ایک منٹ باقی ہے جلد فیصلہ کرو..... تم ابھی بچے ہو۔ ہاتھی سے گنے کھانا عقلمندی نہیں ہے ہمارے منھ نہ لگو، ہمارا گروہ تم سب لوگوں سے اور پولیس سے کہیں طاقتور ہے ..... ہماری قوت بے اندازہ ہے بس دیر نہ کرو کاغذ دلواؤ۔"

مسعود خاموش بیٹھا سالکرام کو گھور رہا تھا۔ اس مشکل اور خطرناک حالت میں بھی اس کا دماغ صحیح وسالم رہا۔ پستول کی نال اسکی آنکھوں سے صرف چھ انچ دور تھی اور اُنگلی لبلبی پر تھی اور ذرا سے اشارہ کی دیر تھی۔

"کاغذ .. فوراً۔ ورنہ .. "

مسعود نے "لو"

یہ کہکر نوٹ بک جیب سے نکالی۔ اور سالک رام کو دیدی۔

"شاباش! تم بڑے سمجھدار لڑکے ہو، اور ہمارے ساتھ ہو جاؤ تو تم بڑے کام کے بن جاؤ میں اپنے ساتھیوں سے تمھارا ذکر کرونگا۔ اب رخصت ہوتا ہوں بندگی" پستول جیب میں رکھا۔ کھڑکی کا کھٹکا کھولا۔ گیلری میں کچھ آوازیں آنے لگیں۔

"لو وہ آپہونچے۔ اب میں جاتا ہوں"

لیکن پھر کچھ خیال آیا اور نوٹ بک کو کھول کر دیکھا تو اس میں کاغذ کا پُرزہ نہ پایا۔

"آہ! کمبخت خوب دھوکہ دیا۔ اسمیں وہ کاغذ ہے ہی نہیں" کھڑکی پر سے کود پڑا

پستول کے دو فیر ہوئے۔ مسعود نے اپنا پستول نکال لیا تھا مگر نشانہ خطا گیا۔

سالگرام:۔ "صاحبزادے خوف کے مارے تمہارے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ نشانہ کیا خاک لگتا"۔ یہ کہکر مسعود پر حملہ آور ہوا، دونوں نے ایک دوسرے کو پکڑا اور کشمکش ہونے لگی۔ پستول کی آوازیں سن کر مرزا صاحب اور اُنکے ہمراہی زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے، سالگرام نے مسعود کو پٹخ دیا، چشم زدن میں سالگرام کا ہاتھ اُٹھا اور ایک چھری مسعود کے شانے میں پیوست ہوگئی۔ مسعود نے سالگرام کو چھوڑ دیا۔ اور اُس نے مسعود کی جیب سے کاغذ کا پرزہ نکالا اور کھڑکی کے باہر کود گیا۔

دوسرے دن اخباروں میں مقدمہ کے تازہ حالات، مقبرہ کے ذخیرہ کا غائب ہوجانا، بہرام کی لاش تہ خانہ میں اور فیروزہ بائی کی لاش دریا سے برآمد ہونا اور مسعود پر سالگرام کے قاتلانہ حملے کا ذکر تفصیل کے ساتھ درج تھا، اسکے ساتھ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ پنڈت بینی مادھو آلہ آباد کے مشہور سراغرساں دہلی آتے ہوئے راستہ سے غائب ہوگئے اور انسپکٹر وقار حسین بھی لاپتہ ہیں۔

اس سے صاف ظاہر تھا کہ بہرام کا گروہ جو کچھ عرصے سے خاموش اور معطل تھا اب سرگرمی کی جانب مائل ہوا ہی اور اپنے دشمنوں پر ہر جگہ غالب آرہا ہی۔ انسپکٹر وقار حسین اور بینی مادھو کو بہرام کے لوگ لے بھاگے، مسعود جس کی ذات سے کچھ مقابلہ کی امید تھی وہ غریب بھی زخمی ہوکے کچھ عرصہ کے لیے بیکار ہوگیا۔ پولیس پہلے ہی سے لاچار تھی۔ اب اُس شاطر گروہ کا مقابلہ کرتا تو کون کرتا۔

باب ۹

مُقابلہ

اس واقعہ کے دو مہینے بعد کا ذکر ہے۔ شام کے وقت آندھی آئی اور کچھ دیر بعد بوندیاں پڑنے لگیں مسٹر جیپال اپنے بالاخانہ واقع کوچہ پنڈت میں کتابیں گرد سے صاف کرکے قرینہ سے رکھ رہے تھے۔ بوندیاں پڑتے ہی کھڑکی کھولدی۔ کہیں باہر جانے کا موقع نہ تھا کھانا کھا کر آرام کرسی بچھا سگار پینا شروع کردیا۔ شام کی ڈاک کے تازہ اخبار میز پر تھے اُٹھا کر پڑھنے لگے۔

کچھ عرصہ سے اخباروں میں مقدمہ نور محل کے حالات بڑی کثرت سے چھپ رہے تھے مسعود کے زخمی ہوجانے کے بعد لوگوں نے قیاسات کے گھوڑے کی باگ ڈھیلی کردی۔ ہر شخص جو مضمون لکھ سکتا تھا اپنی سمجھ اور عقل کے موافق رائے کا اظہار کرتا تھا اخبار کے نامہ نگار حشرات الارض کی طرح نور محل پر آئے دن حملہ کرتے تھے اور ایک نہ ایک ہیچ کی بات نکالتے تھے۔ آخر کار مسعود حسن کی تیزی اور ذہانت کا لوہا سب مان گئے عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ مقدمہ اب ختم ہوگیا، کیونکہ زخمی ہوکے جہاں بہرام غائب ہوا تھا وہ جگہ معلوم ہوگئی تھی اور وہاں آغا مرزا کی لاش کا ملنا، دوسرے لفظوں میں بہرام کو مردہ بنانا بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا تھا، فیروزہ بائی کی لاش بھی مل گئی تھی، اب مقدمہ میں باقی ہی کیا رہ گیا تھا لیکن مسعود کے نزدیک ابھی بہت کچھ باقی تھا۔ کمزوری اور زخم کی تکلیف کی وجہ سے مفصل بیان نہ کرسکا تھا۔ اسلیے عوام میں نیز اخبارات میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہورہی تھیں مسعود نور محل کے

ایک کمرے میں ڈاکٹروں کے زیر علاج تھا۔ سہراب جی نے اسکے علاج اور تیمارداری کا خرچ اپنے ذمہ لیا تھا اور تار دے کر مسعود کے والد کو بھی بریلی سے بلا لیا تھا۔ خود سہراب جی اور رتن بائی گھنٹوں مسعود کے کمرے میں بیٹھے اور اس کا دل بہلاتے آخرکار مسعود کو صحت ہونے لگی اور خاقت کی تجسس آن حالات کے معلوم کرنیکے لیے جنکا وعدہ مسعود نے مرزا رحیم بیگ سے کیا تھا بڑھنے لگی۔ کسی کا خیال تھا کہ اب کوئی دن میں بیہ بھید بالکل روز روشن کی طرح صاف حل ہو جائیگا۔ کوئی کہتا تھا کہ سانگرام جس کی تلاش میں پولیس شب و روز سرگردان تھی پکڑا جائیگا اور تازہ حالات معلوم ہونگے۔ غرضکہ جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ لوگوں کو ابھی تک انسپکٹر وقار حسین اور بینی مادھو کی گمشدگی کا حال اس سے زیادہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ اول الذکر ایک دن صبح گھر سے گئے اور واپس نہ آئے۔ دوسرے کی بابت صرف اس قدر معلوم ہوا کہ وہ الہ آباد سے دہلی آنے کی نیت سے روانہ ہوئے پالکی گاڑی میں خود بیٹھے چھت پر اسباب رکھا اسٹیشن کے راستہ میں دو آدمی چلتی گاڑی میں سوار ہوئے اور بینی مادھو کو بے قابو کر لیا کوچوان تیزی سے گاڑی ہانکتا ہوا لے گیا اور راہگیر دیکھتے رہ گئے۔ اس کے بعد کچھ معلوم نہیں کہ بینی مادھو کا کیا حشر ہوا۔ تمام سی، آئی، ڈی، کا عملہ اس عیاری پر دانت پیستا تھا مگر کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔

سب سے زیادہ حیرت لوگوں کو سانگرام کی حرکت پر آتی تھی۔ آخر اس ذرا سے کاغذ کے پرزہ میں کیا راز پنہاں تھا کہ کمبخت نے اس بیدردی کے ساتھ مسعود پر حملہ کیا۔

ایک لفظ جو مسعود نے مرزا صاحب کی موجودگی میں حل کیا تھا اسمیں کچھ عجیب و غریب راز نہ تھا اور سوائے فیروزہ بائی کے اس سے کچھ اور مطلب نہیں نکل سکتا تھا۔

پرانے وقتوں کا کاغذ! آخر کوئی اسرار ضرور تھا۔ اگر یہ نہیں تھا تو کسی مدرسے لڑکے کی کاپی کا ورق ہوگا جس پر ہندسے اور نقطے لگے تھے اس تحریر میں کوئی ایسا راز تھا جس سے بہرام کی قوت اور عظمت پر اثر پڑتا تھا۔ لیکن مسعود کوئی دن میں یہ معمہ حل کر دیگا اور پبلک کی بےچینی رفع ہو جائیگی۔ اس مرتبہ بہرام کے ساتھیوں کو سخت مشکل پیش آئیگی کیونکہ ذاتی انتقام کے جوش سے مسعود کی سرگرمی [illegible] ہو جائیگی

مسٹر رجپال اخبار پڑھتے جاتے تھے اور [illegible] بڑی [illegible] سگار پی رہے تھے اخبار انہوں نے کھولا تو پہلے ہی صفحہ پر یہ [illegible] درج تھا۔

مقدمہ نور حسن

مسٹر مسعود حسن اب بالکل تندرست ہوگئے [illegible] وعدہ کیا ہے کہ اس عجیب و غریب مقدمہ کے حالات [illegible] ہمیں عنایت کریں گے۔ کل ہمارے ناظرین [illegible] واقف ہو جائیں گے۔

"بڑی دلچسپ خبر ہے۔ کیوں؟"

یہ سن کر مسٹر رجپال کرسی سے اچھل پڑے [illegible] کہ اُگالدان میں گرا۔ انہوں نے کرسی کے پیچھے کسی اجنبی کو کھڑا پایا فوراً دوسرے کمرے سے پستول لانے کا ارادہ کیا مگر صورت سے خطرہ [illegible] چھوڑ دیا اور آگے بڑھ کے غور سے دیکھنے لگے۔ ایک [illegible] لباس اُس پر ایک کالا لبادہ سر پر عمامہ [illegible] کا اظہار ہوتا تھا۔ مسٹر رجپال نے تعجب اور غصے [illegible]

اجنبی کچھ مسکرایا اور جواب نہ دیا۔

"بولتے نہیں، تم کون ہو؟ اور یہاں کس طرح پہونچے؟ اور آنے سے کیا مطلب ہے؟"

اجنبی:- "کیا تم مجھے نہیں جانتے؟"

"جی نہیں ..... نہیں۔"

"بڑے اچنبھے کی بات ہے؟ مسٹر رچپال آپ اپنی یاد کو تازہ کیجئے۔ میں آپ کا پرانا نیاز مند ہوں۔ ایک خاص قسم کا دوست ......؟"

مسٹر رچپال (اجنبی کا ہاتھ مضبوط پکڑ کر) "تم!. .....تم!. ہرگز وہ دوست نہیں ہو جس کی طرف اشارہ کرتے ہو۔ تم غلط کہتے ہو۔"

اجنبی (قہقہہ لگا کر) "پھر تم اس وقت اپنے اس دوست کا تصور کیوں کر رہے تھے؟"

اس قہقہہ سے سب کچھ ظاہر ہو گیا۔ وہی پرانی ہنسی۔ وہی پرانا قہقہہ جس سے مسٹر رچپال نے بارہا لطف اٹھایا تھا مگر بہرام تو مر چکا لاش بھی مل گئی۔ بہرام کا بھوت تو نہیں تھا۔ رچپال کچھ خوف اور کچھ جوش میں آ کے بولے۔

"نہیں! نہیں! ہرگز نہیں۔ مجھے کبھی یقین نہیں آ سکتا!"

"میری موت کا حال سُن کر کیا آپ نے یقین کر لیا کہ میں واقعی مر گیا؟ بھوت پریت آپ کے نزدیک بیہودہ باتیں ہیں ورنہ مجھے شاید بہرام کا بھوت تصور کرتے؟ آہ! مسٹر رچپال کیا دنیا سے انصاف بالکل اٹھتا جاتا ہے؟ کیا آپ نے یقین کر لیا کہ میں ایک لڑکی کی بندوق چھوٹنے کی موت مر جاتا؟ کیا ہو سکتا ہوں یہ تو سراسر بے انصافی ہے۔"

"تو واقعی تم ہو! ..... نہ (کچھ غور سے دیکھ کر) تمہارا حلیہ دلیا۔ لاچار ہو کہ کسی طرح یہ خیالات میں نہیں آتے۔"

"اگر ایسا ہی تو بڑے اطمینان کی بات ہی۔ آپ جیسے دوست جنکے سامنے میں بلا تصنع باتیں کر رہا ہوں مجھے پہچاننے سے قاصر ہیں تو دوسرے آدمی ہرگز نہیں پہچان سکتے"
رئیس نے آواز بنا کر بولنا بھی چھوڑ دیا۔ مسٹر رجپال نے اُسکی آواز پہچانی ؛ پھر تو غور کرنے سے اسکی آنکھیں، پیشانی، چہرہ، سب کچھ اصل سے مطابق کرنے لگا"

"ہائیں بہرام!"

"ہاں بہرام" (کرسی سے اُٹھ کر) "میں وہی بہرام ہوں جسے دو منٹ ہوئے آپ تہ خانے میں مُردہ سمجھ چکے تھے۔ آپ کیا تمام دنیا یہی سمجھتی ہی۔ اب بہرام نے دوسرا جنم لیا ہی۔ بہرام ایک بار پھر زندہ ہی، چلتا پھرتا ہی، آزاد ہی اور ایک بار پھر ارادہ کرتا ہی کہ اس عجیب و غریب دنیا میں اپنی طاقت کا اظہار کرے"

اس پر رجپال خوب دل کھول کے ہنسے۔

"واقعی تم بہرام ہو . . اس بار تم بہ نسبت پار سال کے جب میں نے تمھیں آخری بار دیکھا تھا زیادہ زندہ دل، زیادہ قوی، زیادہ ستم ظریف نظر آتے ہو، لاؤ ملا تھ"

"مسٹر رجپال پچھلی مُلاقات کا ذکر نہ کیجیئے، ایک سال نہیں دس سال گزر گئے اور لوگوں کا ایک سال بہرام کے لیے دس سال سے کم نہیں۔ مدت کا حساب دنوں سے نہیں بلکہ کاموں اور خیالات سے کرنا چاہیئے"

"لیکن تم یہاں پہونچے کس طرح۔ دروازے بند تھے"

"میں دروازے سے آیا۔ جب دوسرا کمرہ خالی پایا تو یہاں کھڑکی کے راستہ چلا آیا"

"لیکن دروازہ مقفل تھا"

"آپ جانتے ہیں کہ بہرام کے لئے قفل اور زنجیریں کوئی روک نہیں ہیں۔ مجھے

آپ کے کمرہ کی ضرورت تھی اور میں یہاں چلا آیا۔"

"کمرہ تمھارا ہی ہے۔ جب تک جی چاہے ٹھہرو۔ اگر ضرورت ہو تو میں دوسرے کمرے میں چلا جاؤں۔"

"جی نہیں آپ کی موجودگی سے میرا کوئی ہرج نہ ہوگا بلکہ دلبستگی کے لیے شاید کچھ مشغلہ ملے گا۔"

"کیا کوئی اور شخص آنے والا ہے؟"

"ہاں میں نے دس بجے کا وقت مقرر کیا ہے" (گھڑی دیکھکر) "ٹھیک دس بجے ہیں۔ اگر میرا تار اُسے مل گیا تو وہ کوئی دم میں یہاں آجائے گا۔"

بات ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "دیکھا میں ٹھیک کہتا تھا۔ آپ تکلیف نہ کریں میں خود جاکر دروازہ کھولتا ہوں۔"

مسٹر رچپال حیران تھے کہ دیکھیے آج کیا گُل کھلتا ہے۔ کس سے مُلاقات ہوتی ہے۔ اتنے میں بہرام ایک نوجوان آدمی کو ساتھ لیے آپہونچا۔ بہرام نے ہاتھ بڑھاکے برقی روشنی کا بٹن دبایا تمام کمرہ روشن ہوگیا اور بہرام اور نوجوان آدمی ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ گویا ایک دوسرے کے دل کا حال معلوم کررہے تھے۔ یہ عجیب دلکش نظارہ بعینہ ایسا تھا جس طرح کشتی سے پہلے دو برابر کے پہلوان ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ مگر نوجوان کون ہے؟ رچپال نے اُس جیسے چہرہ کی تصویر اخباروں میں دیکھی تھی، مگر کس سلسلہ میں؟

بہرام نے "مسٹر رچپال! میں بڑی خوشی کے ساتھ آپ کا تعارف مسٹر مسعود حسن سے کراتا ہوں۔"

پھر نوجوان کی طرف متوجہ ہوکر "مسٹر مسعود میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں کہ آپ نے اوّل تو میرا خط پاکر مقدمہ کے حالات کا شائع کرنا میری ملاقات تک ملتوی رکھا۔

دوم اس تکلیف کا جو آپ یہاں ملنے آئے۔"

مسعود (مسکرا کر) "آپ کے حکم ماننے کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ آپ نے میری ذات پر نہیں بلکہ میرے والد پر حملہ کرنے کی دھمکی دی ہے۔"

بہرام (قہقہہ لگا کر) "ہمیں یہ وقت غنیمت سمجھنا چاہیے۔ میں جانتا تھا کہ آپکو اپنی جان کی مطلق پروا نہیں ہے لیکن اپنے والد کو معرض خطر میں دیکھنا آپ کو کبھی گوارا نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال سے میں نے آپ کے والد کا ذکر کیا۔ آپ نے سالگرام کے حملہ کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپ کو اپنی جان چنداں عزیز نہیں ہے، البتہ والد کو تکلیف میں دیکھنا آپ برداشت نہیں کر سکتے۔ میں نے آپ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا، اور آپ کی اس عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

"جو کچھ بھی ہو میں یہاں حاضر ہوں۔"

بہرام نے کرسی آگے بڑھائی اور مسعود کو بٹھایا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے کہا "اگر آپ کو شکریہ قبول کرنے میں تامل ہے تو مہربانی کر کے میری معافی قبول کیجیے۔"

"معافی! معافی کیسی؟"

"اس بے رحمی کی بابت جو سالگرام نے آپ کے ساتھ برتی۔"

"واقعی مجھے تعجب ضرور ہوا تھا۔ بہرام کے طرز عمل کے خلاف تھا کہ کسی کے چھری بھونکی جائے۔"

"آپ یقین کیجیے۔ سالگرام کی یہ حرکت میری مرضی اور ایما کے سراسر خلاف تھی۔ سالگرام ہمارے گروہ میں حال ہی میں بھرتی ہوا ہے۔ اس مقدمہ کے سلسلہ میں میرے دوستوں نے مناسب سمجھا کہ مرزا صاحب کے پیشدست کو بلا لیں تاکہ آپ کا نقل و حرکت کی نگہداشت بخوبی ہو سکے۔"

"آپ کے دوستوں نے بڑی دانشمندی سے کام لیا۔"

"بیشک سالگرام بڑے کام کا ثابت ہوا لیکن جیسا کہ نو آموز لوگوں کا طریقہ ہوتا ہے، اُس نے ضرورت سے زیادہ سرگرمی کا اظہار کیا اور اپنی کارگزاری کا سکہ جمانے کے لیے آپ کو زخمی کیا اور میری تمام تدابیر کو درہم و برہم کر دیا۔"

"کچھ نہیں زخم معمولی تھا، اب میں بالکل تندرست ہوں۔"

"نہیں لیکن میں نے سالگرام کو اس حرکت پر کافی سزا دیدی ہے۔ آپکی تفتیش اس تیزی کے ساتھ جاری تھی کہ اُسے فوراً اپنی عقل کے موافق کام کرنا پڑا۔ کاش آپ چند گھنٹے کی مہلت نہیں دیتے تو آپ کو اس زخم کی تکلیف نہ ہوتی۔"

"تو شاید میرا بھی وہی حشر ہوتا جو وقار حسین اور بنی مادھو کا ہوا یعنی آپ کے گُرگے مجھے بھی اُڑا لے جاتے۔"

بہرام (قہقہہ لگا کر) "بیشک! نہ آپ کو صدمہ پہونچتا اور نہ آپکے زخم کا خیال کر کے مجھے روحانی تکلیف ہوتی۔ آپ یقین کریں کہ مجھے سالگرام کی اس حرکت کی وجہ سے سخت اذیت پہونچی اور میں بیحد شرمندہ ہوں، کیا مجھے معاف نہیں کر سکتے؟"

مسعود (جوش سے) "یہاں تنہا آ کر مجھسے ملاقات کرکے جو اعتماد آپنے مجھپر کیا ہے اُس نے مجھے سب کچھ بھلا دیا ہے اگر میں چاہتا تو انسپکٹر وقار حسین کے ساتھیوں کو بہرا دلے آتا اور آپ کو قید کر دیتا۔"

ان دو سرغنوں کا معاملہ [illegible] ختم ہو گیا۔ ایک طرف تو بہرام جو اپنی قوت دکھلا کر [illegible] سکے عوام پر اور خصوصاً پولیس پر بہت بھاری [illegible] ساتھ مسعود [illegible]

[illegible]

اور آہستگی سے جواب دے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود بہرام بھی لڑکے کی بے تکلفی اور سادگی سے مرعوب ہو رہا تھا اور بجائے اُس پرزور لب و لہجہ کے جو بہرام ایسے موقعوں پر برتتا تھا، اسکی آواز میں رکاوٹ اور پس و پیش کے آثار نمایاں تھے گویا کسی چیز کی تلاش یا انتظار میں ہے، رچپال حیران تھا کہ بہرام کو کس کا انتظار ہے، اتنے میں کسی نے دروازہ پر آواز دی اور بہرام خود دوڑ کے دروازہ کھولنے نیچے گیا اور ایک لفافہ ہاتھ میں لیے واپس آیا۔ اور "معاف کیجئے" کہکر لفافہ چاک کیا۔ اس میں ایک تار تھا جسکے پڑھتے ہی بہرام کا چہرہ منور ہو گیا، پیشانی کی رگیں بشاشت سے پھول گئیں اور وہ پھر ایک مرتبہ اپنی اصلی شان میں نظر آنے لگا۔ گویا پھر تمام واقعات پر اور تمام لوگوں پر حکومت کرنے لگا۔ اُسنے تار کو میز پر بچھایا اور زور سے گونسہ مار کر چلایا"

"اچھا میاں مسعود سنو! یا تم ہو یا مَیں ہوں"

مسعود نے خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ اس دھمکی کو سُنا اور کچھ جواب نہ دیا۔

بہرام نے کسی قدر سخت لہجہ سے کہنا شروع کیا۔

"بس اب تصنع اور بناوٹ کو دور کرو، اخلاق اور تکلف کی باتیں، یا دوسرے الفاظ میں عیاری اور مکاری کو خیرباد کہو اور خوب کان کھول کر سن لو کہ ہم تم آپس میں دشمن ہیں، ہم ایک دوسرے کی قوت اور حکمت عملی سے واقف ہیں اور ہم آپس میں دشمنوں جیسا برتاؤ کرتے ہیں، اسلیے اخلاق اور تکلف کو بالائے طاق رکھکر ہمیں ایک دوسرے سے دشمنوں کی طرح باتیں کرنا چاہیے مَیں دشمنوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کبھی نہیں کرتا۔ یہ تمھاری خاص رعایت ہے ورنہ بجائے نامہ و پیام کے تمھارے ساتھ بنی مادھو اور وقار حسین جیسا برتاؤ کرنا بالکل آسان تھا۔ یہ سب سے آخری موقع تمھیں دیا جاتا ہے اگر تم اس سے فائدہ نہیں

اُٹھاؤگے اور مجھے دق کرنے سے باز نہ آؤگے تو تمھارے لیے اچھا نہ ہوگا۔ آج مَیں تم سے
پکّا وعدہ لیے بغیر ہرگز نہ جاؤنگا اور اگر تم انکار کروگے تو سمجھ لو کہ اعلانِ جنگ ہے۔"
مسعود بڑے تعجب سے بہرام کی غضبناک باتیں سنتا رہا اور سنجیدگی سے جواب دیا:۔

"آخر اس غصّے اور غضبناکی کا سبب؟ مَیں بہرام کو ایسے چھوٹے دل اور ایسی
کمزور طبیعت کا آدمی نہ جانتا تھا۔ بہرام کی رہی سہی جو وقعت میرے دل میں تھی تم
اُسے بھی کھوئے دیتے ہو۔ تمھارا اندازِ گفتگو بالکل چھوٹے درجہ اور معمولی آدمیوں کا
سا ہے۔ اگر اتفاق سے ہم ایک دوسرے کے خلاف کام کر رہے ہیں تو دشمنی اور دشمنوں
کے برتاؤ سے کیا تعلق؟"

"بہرام اس جواب سے کسی قدر جھینپا لیکن غُرّایا اور میز پر دونوں ہاتھ رکھکر
جُھکا اور کہنے لگا:۔

"دیکھو میاں صاحبزادے! خوب کان کھول کر سُن لو! لفظی تکرار سے کچھ
بحث نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آٹھ برس سے تمھاری جیسی قابلیت کا کوئی آدمی میرے
مقابلہ پر نہیں آیا۔ بمبئی، مادھو اور وقار حسین کو تو مَیں بچّوں کی طرح اُنگلیوں پر نچاتا
ہوں لیکن تمھارے مقابلہ میں مجھے اپنے بچاؤ کی فکر کرنا پڑتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی پیچھے بھی
ہٹنا پڑتا ہے۔ تم بھی جانتے ہو اور دنیا بھی یہی سمجھتی ہے کہ مسعود نے بہرام پر قابو پالیا
ہے۔ میری سب تدبیریں اُلٹ پُلٹ ہوئی جا رہی ہیں۔ جن باتوں کو میں پوشیدہ رکھنا
چاہتا تھا تم نے اُنھیں ظاہر کر دیا ہے۔ تم مجھے ستاتے ہو، چلتی گاڑی میں روڑا اٹکاتے
ہو، دل لگی بہت ہو چکی اور باوجود سالک رام کی تنبیہ کے باز نہیں آتے ہو، اب
میں تم سے پھر کہتا ہوں اور اصرار کے ساتھ کہتا ہوں میرے صبر کا پیالہ اب بھر گیا ہے

اور میں کوئی رعایت نہ کرونگا"

مسعود "بہت خوب! لیکن چاہتے کیا ہو؟"

"صلح! تم اپنا کام کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"

"یعنی یہ کہ تم آزادی کے ساتھ چوری اور بدمعاشی کرتے پھرو اور میں پڑھنے لکھنے سے کام رکھوں خوب!"

"پڑھو لکھو یا جہنم میں جاؤ اس سے مجھے کچھ غرض نہیں ہے...... لیکن تم میرے پیچھے نہ پڑو... مجھے اطمینان اور آزادی چاہیے......"

"میں تمھارے اطمینان اور آزادی میں اب کس طرح مخل ہو سکتا ہوں؟"

بہرام نے مسعود کا ہاتھ زور سے پکڑا اور ہلا کر کہا "تم خوب واقف ہو بے پر کی نہ اڑاؤ تم اس وقت ایسے راز سے واقف ہو جو میرے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے تم میرا راز معلوم کرنے کے مختار تھے لیکن تمھیں کوئی حق نہیں ہے کہ عوام کو اس سے آگاہ کرو"

"کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ میں تمھارے راز سے واقف ہو گیا ہوں"

"بیشک مجھے پورا یقین ہے کوئی دن اور کوئی گھنٹہ ایسا نہ جاتا تھا کہ میں نے تمھاری تفتیش اور تمھارے خیالات کی نگرانی نہ کی ہو جس وقت سالگرام نے تمھیں زخمی کیا تم تمام راز افشا کرنے پر تلے ہوئے تھے لیکن بعد میں تم اپنے والد کے خیال سے رک گئے اب اخبار [illegible] میں سب حال چھپوانا چاہتے ہو مضمون لکھا جا چکا ہے اور آج ایک گھنٹے میں چھپنے کے لیے مرتب ہو جائے گا اور کل دنیا میں [illegible] ہو جائیگا"

"[illegible]"

بہرام کھڑا ہو گیا اور غصے سے [illegible] پھینک کر کہنے لگا "[illegible]

ہرگز نہ چھپنے پائے گا۔"

"ضرور چھپے گا۔"

مسعود کو بھی غصہ آگیا اور وہ بھی تن کر کھڑا ہوگیا۔ مسٹر جیپال سمجھے اب دونوں میں [illegible]
ہاتھا پائی ہوتی ہے۔ مسعود کا چہرہ سرخ ہوگیا، اسکے دل میں خود ہی بہادر لڑنے کا جوش
اور خطرہ کا احساس موجود تھا۔ بہرام کی آنکھیں چمکنے لگیں جیسا کہ کوئی پہلوان اپنے
مدِ مقابل سے لڑتے وقت خوش ہوتا ہے۔

بہرام "کیا مضمون مطبع میں بھیج چکے ہو؟"

"ابھی نہیں۔"

"کیا تمھاری جیب میں ہے؟"

"جی نہیں میں ایسا احمق نہیں تھا کہ اسے لے کے یہاں آتا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"اسسٹنٹ ایڈیٹر کے پاس سربمہر لفافہ میں موجود ہے۔ اگر میں بارہ بجے تک
دفتر انہیں میں نہ جاؤنگا تو مضمون درج اخبار ہو جائے گا۔"

"کیوں بدمعاش تو نے اتنا بھی انتظام کر دیا ہے؟"

بہرام کا غصہ بڑھتا جاتا تھا۔ مسعود نے اس پر قہقہہ لگایا۔

بہرام نے چلا کر کہا "بہرام [illegible] تم نہیں جانتے میں کون ہوں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"نہیں"

"اپنے مضمون کو پھاڑ ڈالو ... ..."

"نہیں"

"اڈیٹر سے کہدو کہ میں نے غلطی سے مضمون بھیجدیا تھا"

"نہیں"

"اور ایک دوسرا مضمون لکھ کر اڈیٹر کے حوالہ کردو! اُسمیں مقدمۂ نور محل کے وہی حالات ہوں جو ابتک عوام میں تسلیم کئے گئے ہیں اُسکے سوا ایک حرف نہ ہو"

"ہرگز نہیں"

بہرام غصے سے کانپنے لگا۔ ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں، اس لڑکے کی ضد اور ہٹ سے بہرام تنگ آگیا، میز سے آبنوس کا رول اُٹھایا اور دو ٹکڑے کرڈالے پھر مسعود کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر ایک ایک لفظ پر زور دے کے کہنے لگا:-

"مسعود جو کچھ میں کہتا ہوں تمھیں کرنا پڑیگا۔ تمھیں لکھنا پڑیگا کہ تازہ حالات کی بنا پر تمھیں میری موت کا پورا یقین ہوگیا ہی اور یہ کہ اس میں کوئی شک و شبہ کی بات نہیں ہی یہ میری خواہش ہی کہ تم ایسا کہو کیوں کہ میں لوگوں کو اپنی موت کا یقین دلانا چاہتا ہوں اور اگر تم ایسا نہ کروگے تو . . . "

"تو کیا ہوگا؟"

"آج رات کو تمھارے والد منیٰ، مادھو اور وقار حسین کی طرح غائب ہوجائینگے"

مسعود مسکرایا۔

"ہنسو نہیں جواب دو"

بہرام افسوس ہی کہ مَیں تمہارا کہا نہیں کر سکتا، مَیں وعدہ کر چکا ہوں اور اصل حالات بتانے پر مجبور رہوں۔"

"تو جو باتیں میں کہتا ہوں وہ بیان کردو۔"

"لیکن میں نے اصلی حالات بتانے کا وعدہ کیا ہی۔ آہ! تم نہیں سمجھتے حق بات کے معلوم کرنے اور پھر اُسکے ڈنکے کی چوٹ بیان کرنے میں کیا مزہ آتا ہی، اس دماغ نے سچ بات دریافت کرلی ہی اور خواہ تمھیں کتنا ہی ناگوار ہو، مَیں حق کے کہنے میں گریز نہ کرونگا مضمون حرف بہ حرف چھاپا جائیگا، دنیا کو معلوم ہو جائیگا کہ بہرام زندہ ہے اور یہ بھی کھُل جائیگا کہ وہ اپنے آپ کو مردہ کیوں تصور کرانا چاہتا ہی، دنیا کو اصل واقعات معلوم ہو جائینگے اور میرے والد کو کوئی ہاتھ تک نہیں لگا سکتا۔"

پھر دونوں خاموش ہوگئے اور ایک دوسرے کو تیز نظروں سے دیکھنے لگے، مقابلہ برابر کا تھا اور دیکھنا یہ تھا کہ اب کیا داؤ ہوتا ہی اور کون وار کرتا ہی۔

بہرام نے دانت پیس کر کہا: "اگر تم میرا کہا نہ مانوگے تو یاد رکھو میرے ساتھی اِس بات پر مامور ہیں کہ آج رات کو تین بجے تمھارے گھر جائیں اور تمھارے والد کو نکال لیجائیں اور بمبئی مادھو اور وقار حسین کے پاس پہونچا دیں۔"

مسعود نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور چلا کر کہا۔

"او چور! کیا تو نہیں جانتا کہ میں نے اسکا پہلے ہی انتظام کر دیا ہی، کیا تو مجھے بالکل بیوقوف اور گدھا سمجھتا تھا کہ میں اپنے باپ کو ایسے خطرہ میں رہنے دونگا۔"

اسوقت مسعود کے چہرے پر عجیب خوشی تھی کبھی ہنستا تھا کبھی منھ بناتا تھا اور جو طریقہ اُس نے باتیں کرنے کا اختیار کیا اُس سے برابری اور ہمسری کی شان ٹپکتی تھی

"دیکھو میاں بہرام! تمھاری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اپنی تدبیر کی نسبت ہمیشہ کامیابی کا یقین رکھتے ہو۔ کہو بچا اب تو تم ہارے؟ تم ہمیشہ یہ سمجھتے ہو کہ اخیر میں تمھاری فتح ہوگی اور جانتے نہیں کہ دوسرے لوگ بھی کوئی چال چل سکتے ہیں۔ میری چال بالکل آسان تھی۔"

مسعود بڑے مزے لے لے کر باتیں کر رہا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈال کے کمرے میں ٹہلتا تھا۔ جس طرح لڑکے کسی درندے کو پنجرے میں پاکر چھیڑتے اور دق کرتے ہیں اس وقت وہ اس شاطر چور کو گویا اپنی مٹھی میں لیے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا "بہرام میرے والد بریلی میں نہیں ہیں بلکہ وہ ایسی جگہ ہیں جہاں تمھارے ساتھی تو کیا فرشتوں کا بھی گزر کسی وقت نہیں ہو سکتا اور ایسے لوگوں کی حفاظت میں ہیں جو تم جیسے بدمعاشوں کی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔ میرے والد بریلی میں نہیں بلکہ لاہور کے قلعہ میں ہیں۔ وہاں ایک فوجی افسر میرا دوست ہے۔ رات کے وقت کسی غیر آدمی کا گزر اُسکے مکان پر نہیں ہو سکتا اور جب تک میرا اور تمھارا مقابلہ قائم ہے پہرہ چوکی کا نہایت سخت انتظام رہیگا۔ کیوں میاں بہرام! اب تو قائل ہوئے؟"

کئی منٹ تک بہرام بالکل خاموش کھڑا رہا۔ نہیں معلوم اُسکا خیال کہاں دوڑ رہا تھا اور دل میں کیا ارادہ کر رہا تھا۔ بہرام کی خو [illegible] بڑی مشہور تھی اسکے [illegible] سے لیے اپنے دشمن کو فوراً تباہ و برباد کر دینا چاہیے تھا۔ اسکے ہاتھوں میں جتنا زیادہ [illegible] مسعود چالاک نے خیال کیا کہ کوئی دم میں اس لڑکے کی گردن مروڑ کر کام تمام کیے دیتا ہے۔

مسعود نے ہنس کر کہا "کیوں میاں کیا کہتے ہو؟"

بہرام تیزی سے [illegible] جو ابھی آیا تھا اٹھا کر مسعود کی طرف بڑھا اور نہایت

اطمینان سے کہا: "لو صاحبزادے اسے پڑھو"
مسعود نے لفافہ کھول کر کاغذ نکالا اور کہنے لگا "اس کا مطلب میں کچھ نہیں سمجھتا"
"تم اس کا پہلا لفظ تو سمجھتے ہو کس جگہ سے تار بھیجا گیا ہے؟"
"لاہور"
"ہاں"
مسعود نے دیکھ کر کہا "ہاں میں سمجھتا ہوں لاہور اور آگے"
"اور آگے مضمون بالکل صاف ہے"
اس کا مضمون یہ تھا۔
"اسباب لد گیا اور دوستوں کی حفاظت میں ہے کل صبح ۸ بجے حکم کا انتظار کرینگے باقی خیریت ہے"
"کیوں؟ مضمون بالکل صاف ہے؟ اسباب کی جگہ تم اپنے والد کا نام لکھا جانا پسند نہ کروگے۔ دیکھا کس آسانی سے میرے ساتھیوں نے تمھارے باپ کو لاہور کے قلعہ کے پہرہ چوکی سے اُڑا دیا۔ یہ بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسباب یعنی تمھارے والد لاہور سے علیحدہ کردیئے گئے اب بتاؤ ابکیا کہتے ہو!"
مسعود نے اپنے سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن ضبط نہ کر سکا۔ ہونٹ ہلے اور آنکھیں گویا کسی دور کی چیز کو دیکھنے لگیں، پھر دونوں ہاتھ منھ پر رکھ کر رونا شروع کیا۔
"آبا جان! آبا جان!"

بہرام نے اوّل باہر جانے کا ارادہ کیا لیکن دروازہ کے پاس سے لوٹ آیا اور مسعود کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر نرم اور محبّت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

"میاں مسعود! رونے اور رنج کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مَیں تم سے پہلے ہی کہتا تھا ہاتھی سے گنّے کھانا عقلمندی نہیں ہے۔ دنیا کا یہ عام دستور ہے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جب دو آدمی مقابلہ پر آتے ہیں ایک ہارتا ہے ایک جیتتا ہے۔ اس مقابلہ میں کبھی کبھی جسمانی اور روحانی تکالیف بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ تم تو ابھی بچے ہو، بڑے بڑے بارسوخ اور طاقتور آدمی آج سے نہیں آٹھ برس سے میرا مقابلہ کر رہے ہیں اور ہمیشہ میری ہی جیت رہتی ہے۔ تمھارے لڑکپن اور بھولے پن اور بھولی صورت پر مجھے رحم آتا ہے، دراصل مَیں تمھارا دشمن نہیں ہوں۔ میں تمھاری حیرت انگیز ذہانت اور قابلیت کی بڑی داد دیتا ہوں۔ لیکن خدا کے لیے اس ذہانت اور قابلیت کو کسی اچھے کام میں صرف کرو، میرا مقابلہ کرنا چھوڑ دو، تم خود غور کرو جس آدمی کو پولیس آٹھ برس کی شدید محنت میں زیر نہ کر سکی تمھارے قابو میں کب آ سکتا ہے۔ سانپ اور نیولے کا کچھ مقابلہ ہو بھی سکتا ہے لیکن بلّی اور چوہے کا کیا مقابلہ۔ نہ تم میری قوت سے واقف ہو نہ میرے زور سے آگاہ۔ فرض کرو کہ نیلی چھتری کا راز جسے تم ظاہر کرنا چاہتے ہو ایک بیشمار اور بے اندازہ خزانہ ہے جو میرے قبضے میں ہے، یا ایسا مقام ہے جہاں میں دنیا کی دسترس سے محفوظ رہ سکتا ہوں۔ علاوہ اسکے میری تمام ذہانت مدت العمر میں ایک خاص قوت اور قابلیت کا انسان دنیا میں دوسرے عجائبات کی طرح پیدا کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ برسوں کی اَن تھک محنت سے اس قابل ہوا ہوں کہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں کامیاب ہوتا ہوں اور کوئی دنیوی قوت میری مرضی کے سامنے کارگر نہیں ہو سکتی۔

پھر سوچو تو سہی کہ تم کس شمار و قطار میں ہو۔ تمھیں کیا معلوم ہے کہ کل کیا ہوگا اس مقابلہ میں کیا کیا مصیبت تمھاری قسمت میں لکھی ہے۔ تم اپنی ذہانت اور قابلیت سے کامیابی کی امید رکھو گے لیکن تمھیں وقت پر معلوم ہوگا کہ تمھاری سب محنت اکارت گئی۔ میرے معمولی شعبدے ذرا سے اشارے میں تمھارا سب کھیل بگاڑ دینگے۔ میں منت کہتا ہوں کہ میرے ساتھ نہ اُلجھو۔ خدا کے لیے میری بات مانو اور میرا مقابلہ چھوڑ دو۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ میرے ہاتھوں تمھیں کسی قسم کی اذیت پہونچے"

مسعود نے منھ پر سے اپنے ہاتھ ہٹائے۔ معلوم نہیں کہ بہرام کی یہ سب بکواس اُس نے سُنی یا نہیں۔ وہ شاید اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ کیا فیصلہ کرے۔ دو تین منٹ تک چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بہرام سے مخاطب ہوا۔

"اگر میں مضمون بدل ڈالوں اور اگر میں تمھاری موت کی خبر کی تصدیق کر دوں اور پھر کبھی تمھارے خلاف نہ ہوں تو کیا تم قسم کھا کر وعدہ کرتے ہو کہ میرے والد کو رہائی مل جائے گی؟"

"میں قسمیہ کہتا ہوں۔ میرے ساتھی تمھارے والد کو ایک دوسری جگہ لے گئے ہیں اگر کل صبح ۷ بجے اخبار انیس میں میری ہدایت کے موافق تمھارا مضمون چھپ جائیگا تو میں فوراً تار کے ذریعے سے تمھارے والد کو آزاد کرا دونگا۔

"بہتر ہے۔ مجھے آپ کی شرط منظور ہے"

یہ کہہ کر مسعود نے اپنی ٹوپی سر پر رکھی۔ کوٹ کے بٹن لگائے اور رخصت ہوا۔ گویا اُس نے شکست قبول کر لی اور زیادہ باتوں میں وقت ضائع کرنے میں کوئی فائدہ بھی نہ دیکھا۔

باب ۱۰

افشائے راز

دوسرے دن صبح کو ۹ بجے مسٹر چپال نے اپنا آدمی بھیج کر اخبار انیس کا تازہ پرچہ منگایا۔ آدمی کسی قدر دیر سے آیا کیونکہ اس دن اخبار کی اتنی مانگ تھی کہ بڑی مشکل سے پرچہ مل سکا۔ مسٹر چپال نے بڑی بے صبری سے طبلق کھولی پہلے ہی صفحہ پر حسب ذیل مضمون درج تھا۔

جناب اڈیٹر صاحب تسلیم۔

قبل اس کے کہ میں اپنے وعدہ کے مطابق واقعہ قتل کے اصل حالات بیان کروں ضروری سمجھتا ہوں کہ میں آپ کے کثیر الاشاعت اخبار کے ذریعہ سے پبلک کا تہہ دل سے شکریہ ادا کروں جس عنایت اور مہربانی کا اظہار اس ناچیز کے ساتھ میری علالت کے زمانہ میں ہر درجہ اور طبقہ کے اصحاب نے کیا ہے میں اسکا کسی طرح مستحق نہ تھا جناب کی ہمدردی اور قدردانی نے میرے دل پر بہت اثر کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ واقعہ قتل کے پوشیدہ حالات جو ابھی تک عام طور پر معلوم نہیں بطور شکریہ پبلک کے سامنے پیش کروں۔ اس مضمون میں ان تمام خیالات کا اظہار کرنا نہیں چاہتا جن کی مدد سے میں واقعہ قتل کو حل کر سکا بلکہ صرف ان باتوں کو جن سے میں نتیجے پر پہونچے [illegible] تفتیش معمولی [illegible] تصویر [illegible]
[illegible]

ناظرین کے سامنے پیش کرنا محض تضیع اوقات ہی۔ میں صرف اُن باتوں کو بیان کرونگا جو اس واقعہ کی روح رواں ہیں۔ بعض واقعات کی بابت ناظرین کہیں گے کہ انکی نسبت کوئی ثبوت نہیں پیش کیا گیا۔ اس کے متعلق عرض ہی کہ اس معمہ کے حل کرنے میں صرف واقعات کی منطق سے کام نہیں لیا ہی بلکہ خیالی تگاپو سے بھی بہت کچھ مدد لی ہی۔ اگر ہم محض واقعات کی بنا پر نتائج اخذ کریں تو بہرام سے شاطر آدمی کے مقابلہ میں کبھی منزلِ مقصود پر نہیں پہونچ سکتے۔"

"سب سے پہلا معمہ جو حل طلب تھا یہ تھا کہ بہرام بے آب و دانہ بے یار و مددگار اور بغیر دوا دارو کے پانچ چھ ہفتہ تک اُس تنگ و تاریک غار میں کس طرح زندہ رہ سکتا تھا۔

۱۹۔ فروری کی شب میں ۴ بجے کے قریب تصویریں چُرائے جانے کے بعد زخمی ہوتا ہی اور مقبرہ سے کچھ دور گر پڑتا ہی۔ اپنے آپ کو سنبھالتا ہی، آہستہ آہستہ کھسکتا ہی لیکن پھر گر پڑتا ہی اور اتنی طاقت اپنے آپ میں نہیں پاتا کہ مقبرہ تک پہونچ جائے جہاں زیر زمین چھپنے کی جگہ اُس نے بُت اور کتبے لے جاتے وقت دریافت کر لی تھی۔ اس شش و پنج کی حالت میں فیروزہ بائی اُس کی تلاش میں آتی ہی اور بندوق ہاتھ میں لئے موقع پر پہونچ جاتی ہی۔"

"اِن دونوں میں کیا باتیں ہوتی ہیں اُن کا قیاس ہم اُس ملاقات کے نتیجہ سے بآسانی کر سکتے ہیں۔ خیال کیجئے کہ اس نوجوان عورت کے قدموں میں ایک آدمی زخم خوردہ اور نیم جان پڑا ہی فیروزہ بائی کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس بیچارے کی یہ حالت اور بے بسی اُسی کے نشانہ کا نتیجہ ہے۔ ایسی حالت میں وہ اُس کی مدد کرے گی یا معمولی چور اور مجرم کی حیثیت سے پولیس کے

حوالہ کردے گی؟

"اگر یہ شخص جہانگیر کا قاتل ہو تو بیشک اُسے حوالہ کرنے میں کوئی پس وپیش نہ ہوگا۔ لیکن دبی زبان سے جلد جلد بہرام لڑکی کو یقین دلاتا ہو کہ جہانگیر نے مسٹر سہراب جی پر حملہ کیا اور سہراب جی نے جہانگیر کے چُھری بھونک دی۔ لڑکی اُسے یقین کرتی ہو اور اپنی نشانہ بازی پر قدرے متاسف ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اُسے کیا کرنا چاہیے؟"

"انھیں یہاں کوئی شخص نہیں دیکھتا تھا۔ خیراتی دور پھاٹک پر تھا اور رُستم مکان کے دوسرے منزل پر نظر سے پوشیدہ تھا۔ فیروزہ کا تاسف ہمدردی اور رحم کی شکل اختیار کرلیتا ہو آخر عورت ذات تھی بہرام کی عاجزی اور منت سماجت پر رحم آگیا، اور ایسی کون عورت ہوگی جو اپنی غلطی معلوم کرنے کے بعد بھی ایک بیکس اور حاجتمند آدمی کی ہمدردی کرنے سے پہلوتہی کریگی۔ بہرام کی ہدایت کے بموجب اُس نے رومال کی پٹی بنائی اور زخم پر باندھ دی کہ خوں بہکر چھپنے کی جگہ کا پتہ نہ دے سکے پھر بہرام نے مقبرہ کی کنجی جیب سے نکالی اور فیروزہ کے حوالہ کی فیروزہ نے ہاتھ کا سہارا دیکے بہرام کو مقبرہ کے اندر پہونچا کر قفل بند کردیا اور باہر نکل آئی اتنے میں خیراتی آجاتا ہو۔ اگر کوئی شخص فوراً مقبرہ کھول کر تلاش کرتا تو بہرام گرفتار ہوجاتا لیکن تھوڑی دیر میں بہرام سنبھلا اور دہلیز کے قریب کا پتھر اُٹھا کر پوشیدہ زینہ کے راستہ سے تہ خانہ میں اُتر گیا۔ اس طرح بہرام اُنھیں ہاتھوں کی مدد سے جنھوں نے اسے زخمی کیا محفوظ و مامون ہوجاتا ہو۔"

"بخت و اتفاق نے فیروزہ بائی کو زخمی چور کا مددگار بنا دیا اور اب وہ مجبور ہو

کہ راز کو افشا نہ کرے اور بجائے اسکے اُسے زخم کی تکلیف سے مرنے نہ دے۔ شروع میں فیروزہ بائی کی ہمدردی محض عورت کی نرم دلی پر مبنی تھی لیکن تہ خانے میں چھپا کردہ بہرام کی ہمراز اور مددگار بن گئی تھی۔ اب اُسے اس حیثیت کو قائم رکھنا ناگزیر تھا۔ یہ کچھ مشکل کام نہ تھا ایک ذہین اور ہوشیار عورت کے لیے اس راز کو پوشیدہ رکھنا معمولی بات تھی۔ سب سے اوّل وہ مرزا رحیم بیگ کو بہرام کا غلط حلیہ بتاتی ہے تاکہ پولیس کو زخمی چور کے بہرام ہونے کا خیال نہ ہو حالانکہ رتن بائی نے ٹھیک بہرام کا حلیہ بیان کیا تھا۔ فیروزہ بائی ہی نے کسی اشارہ کے ذریعہ سے معلوم کر لیا کہ گاڑیبان بہرام کا ساتھی ہے اور اُسے بہرام کی نازک حالت سے آگاہ کر دیا۔ فیروزہ بائی ہی نے اصلی ٹوپی کی جگہ دوسری ٹوپی رکھ دی اس پر ستم ظریفی یہ کی کہ ایک کاغذ کا پرزہ لیا اُس پر دھمکی لکھ کر گاڑی والے کی جیب میں ڈال دیا اُسکے پڑھنے کے بعد فیروزہ بائی پر کیسے شبہہ ہو سکتا تھا۔ یہ فیروزہ بائی ہی کی کارستانی تھی جو کیسے منھ بند کر دیا کہ اُس نے مجھے وقوعہ سے ایک روز پہلے نور محل کے متصل دیکھا تھا فیروزہ بائی کی چالاکی کارگر ہوئی اور میں حراست میں لے لیا گیا لیکن ایک یہ نقصان بھی ہوا کہ اُس وقت سے میری تمام توجہ فیروزہ بائی کی طرف رجوع ہو گئی یہ فیروزہ بائی ہی تھی جس نے بہرام کی چالیس روز تک تیمارداری کی اور ڈاکٹر چٹرجی کے میڈیکل ہال سے تصدیق ہو سکتی ہے کہ فیروزہ بائی کے نام سے روز دوا آتی تھی آخر کار فیروزہ بائی کی توجہ سے بہرام کو صحت ہو گئی۔"

"یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد ناظرین کا دوسرا سوال یہ ہوگا کہ آخر اسکی کیا وجہ ہے کہ باوجود بھلا چنگا اور آزاد ہونے کے بہرام کی مسلسل کوشش یہی ہے کہ عوام

کو اس کی موت کا یقین آجائے۔

"ناظرین نے باتصویر اخبارات میں فیروزہ بائی کے فوٹو سے اندازہ کیا ہوگا کہ فیروزہ بائی نہایت خوبصورت لڑکی ہے جس کے حُسن کا جادو بے اثر نہیں رہتا۔ اُسکے لیے موقع اور محل، درجہ اور امتیاز کوئی روک نہیں ہے۔ بہرام حُسن کی اس دیوی کو روز دیکھتا ہے کہ ہمدردی اور محبت کے ساتھ اسکی تیمارداری کرتی ہے۔ اسکے زخموں کو دھوتی اور مرہم پٹی کرتی ہے۔ کھانا کھلاتی ہے اور شدت تکلیف کے وقت دلاسا دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ بہرام اسکی پُرسحر آنکھوں اور اسکے معطر کپڑوں کی خوشبو اور لب جاں بخش کے اشاروں کو اپنی صحت و عافیت کے لیے ڈاکٹر شیرازی کی ادویات سے بھی زیادہ سمجھنے لگتا ہے۔ جب تک وہ پاس رہتی ہے خوش رہتا ہے۔ آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے تو تڑپنے لگتا ہے۔ احسان اور شکر گزاری محبت اور عشق سے بدل جاتی ہے اُسے دیکھ کر اُسکی آنکھوں میں روشنی، دل میں تازگی بڑھ جاتی ہے۔ تنہائی میں فیروزہ کا خیال اور اُسکی آمد کا انتظار دنیا و مافیہا سے بے خبر رکھتا ہے۔"

"بہرام اس محبت اور ہمدردی کا اس درجہ پاس کرتا ہے کہ اپنے دل کی کیفیت کسی طرح فیروزہ پر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ جوں جوں بہرام کو آرام ہوتا جاتا ہے، فیروزہ بائی اپنی آمد و رفت کا سلسلہ کم کرتی جاتی ہے اور بہرام کے زخم اچھے ہوتے جاتے ہیں تو اسکے پاس آنا بالکل ترک کر دیتی ہے۔ بہرام اس حالت کو صبر و شکر کے ساتھ گوارہ کرتا ہے لیکن بیماری دل جسمانی صحت کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے اور وہ باہر آتے ہی اپنے ساتھیوں کو جمع کرتا ہے اور رات کو فیروزہ بائی کو نکال لیجاتا ہے۔ بہرام اسپر بس نہیں کرتا اُسے اندیشہ ہے کہ پولیس فیروزہ بائی کو ڈھونڈھ

نکالے گی اس لیے اُس دھمکی سے فائدہ اُٹھاتا ہی جو اوّل روز فیروزہ بائی نے پرچہ کاغذ پر لکھکر گارڈیان کے کوٹ میں رکھدی تھی کہ فیروزہ بائی کو مردہ ثابت کرنا چاہیئے اس سے عوام کو یہ بھی یقین ہوگا کہ بہرام مرگیا اور بدلہ لینے کے لیے اُسکے ساتھیوں نے فیروزہ بائی کو قتل کرڈالا۔"

"بہرام جیسا ذہین آدمی محض قیاسات پر اپنی اور فیروزہ بائی کی موت کا یقین دلانے پر قانع نہیں ہوتا اسکے لئے لاشوں کا برآمد کرنا بھی ضروری ہی۔ اُسے معلوم ہی کہ کسی نہ کسی طرح اُسکے پوشیدہ ہونے کی جگہ معلوم کرلونگا اور جب تہ خانہ خالی پاؤنگا تو اُسکے مردہ ہونے پر ہرگز یقین نہ کرونگا۔ اس خیال سے بہرام یہ انتظام کرتا ہی کہ تہ خانہ خالی نہ ملے۔"

"اسی طرح فیروزہ بائی کی موت کا کامل یقین نہیں ہوسکتا جبتک کہ اُسکی لاش دریا سے برآمد نہ ہو چنانچہ بہرام بندوبست کرتا ہی کہ دریا فیروزہ بائی کی لاش اُگل دے۔"

"ایک وقت اِن دونوں موتوں کا عملی طور پر ثابت کرنا مشکل ہی لیکن بہرام جیسے آدمی کے لیے کوئی کام دشوار نہیں۔"

"بہرام کے خیال کے موافق میری کوشش سے تہ خانہ دریافت ہو جاتا ہی اور اسمیں آغا مرزا یعنی بہرام کی لاش ملتی ہی۔ جو لوگ بہرام کی موت کو ممکن الوقوع سمجھے تھے اُنکے لیے اُس لاش کے ملنے کے بعد اور کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہ تھی لیکن میں نے شروع سے کبھی یقین نہ کیا تھا کہ بہرام چوہے کی طرح مرسکتا ہی میں نے فوراً خیال کیا کہ پھاوڑے کے معمولی اشارے سے پتھر کا ٹوٹ جانا اور پھر سے نیچے گرنا کوئی معنی ضرور رکھتا ہی اور پھر پتھر کا کہیں اور جگہ نہیں بلکہ لاش کے عین سر پر گرنا جس سے لاش کا شناخت کرنا

غیر ممکن ہو گیا کوئی اتفاقی بات نہیں ان سب انتظامات میں بہرام کی زیرکی اور چالاکی صاف نظر آنے لگی اور میں نے سمجھ لیا کہ بہرام زندہ ہے اور یہ کسی اور شخص کی لاش آغا مرزا کے کپڑے پہنا کر یہاں رکھدی گئی ہے۔ یہ بات بھی عجیب تھی کہ تہ خانہ دریافت ہونے کے آدھ گھنٹہ بعد فیروزہ بائی کی لاش جمنا سے برآمد ہوتی ہے۔ پھول جانے سے شکل و شباہت کا پتہ نہیں چلتا مگر بلدار کپڑوں کی وجہ سے فیروزہ بائی کی لاش کا یقین کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ نے میری آنکھیں کھولدیں اور میں نے خود غور کرنا شروع کیا میں نے اخبار ایوننگ پوسٹ میں پڑھا تھا کہ چند روز سے رائل ہوٹل میں ایک پارسی نوجوان مرد اور ایک عورت مقیم تھی اور کسی وجہ سے دونوں نے زہر کھا کر خودکشی کر لی مگر رات کے وقت انکی لاشیں غائب ہوگئیں میں نے تفتیش کی تو واقعہ کو صحیح پایا صرف اسقدر فرق تھا کہ لاشیں غائب نہیں ہوئیں بلکہ ایک شخص بمبی سے آیا اور نعش کو دیکھ کر لڑکی کو اپنی بہن بتایا جو نوجوان پارسی کے ساتھ بھاگ آئی تھی۔ ہوٹل والوں نے معمولی کارروائی کے بعد لاشوں کو حوالہ کر دیا۔"

"اجنبی کون تھا؟ سولے بہرام کے چیلے چانٹوں کے اور کون ہو سکتا ہے۔

معاملہ بالکل آسان تھا ایک لاش کو وہ تہ خانہ میں آغا مرزا کے کپڑے پہنا کر لٹا دیتا ہے اور ایک بھاری پتھر ٹھیک سر کے اوپر اس طرح رکھتا ہے کہ معمولی اشارہ سے گر پڑے اور سر کچل جائے۔ دوسری نعش کو فیروزہ بائی کے کپڑے پہنا کر دریا میں ڈالدیتا ہے۔ بہرام اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے نیز اپنی اور فیروزہ بائی کی موت کا یقین دلانے کے لیے ایسی ناپاک حرکت کرتا ہے کہ ہوٹل سے دو مسافروں کی لاشیں اُڑا لے جاتا ہے۔ اس سے بہرام کا صرف یہ مطلب تھا کہ دنیا اسکی موت کا یقین کر کے بالکل خاموش ہو جائے۔ اور اُسے موقع ملے کہ رفتہ رفتہ فیروزہ بائی کو رام کر لے۔"

"بہرام کی راہ میں اُسوقت تین آدمی تھے جن سے اُسے خطرہ تھا۔ پنڈت بینی مادھو الہ آباد کا مشہور سُراغرساں گھر سے چلتے ہی غائب ہوجاتا ہے۔ دوسرے انسپکٹر وقار حسین دہلی کی خفیہ پولیس کا نامور افسر گھر سے باہر جاتا ہے اور لوٹ کر نہیں آتا۔ اب صرف مَیں باقی رہ گیا تھا۔ سالگرام کی چھُری مجھے زخمی کرتی ہے اور عرصۂ دراز کے لیے یہ کانٹا بھی راستہ سے ہٹ جاتا ہے۔ اب صرف ایک بات حل طلب رہ جاتی ہے۔ اُس کاغذ کے پُرزے میں کیا راز پنہاں تھا کہ بہرام ایسی بیدردی سے مجھے زخمی کرادیتا ہے اور پرچہ حاصل کرلیتا ہے کیا بہرام سمجھتا ہے کہ پرچہ جانے سے میرے دماغ سے ہندسوں اور نقطوں کا وہ سلسلہ بھی محو ہوگیا جو میں نے بغور دیکھ لیا تھا، پرچہ اُڑانے پر یہ زور و جبر کیوں روا رکھا گیا ہے؟ مَیں ابھی اس معمّہ کے حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہوں لیکن یا زندہ صحبت باقی۔ دیکھا جائیگا۔ ناظرین انیس کا میں ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور اسید کرتا ہوں کہ واقعات متذکرۂ بالا کی تصدیق رفتہ رفتہ پولیس کی تفتیش سے بھی بخوبی ہو جائے گی"

آخرکار مسعود اپنی بات کا پکا ثابت ہوا۔ بہرام کی گیدڑ بھپکیوں سے مرعوب ہوکر مضمون بدل کے چھاپنے کا وعدہ تو کرلیا مگر بعد میں شاید اُس نے جوانمردی اور اپنے پیارے کالج کی عزت اور شان کے خلاف سمجھا کہ ایک حق بات محض ایک شاطر چور کی دھمکی میں آکر دوسری طرح بیان کی جائے اور تمام دنیا کو جو اُس کے مضمون کا انتظار کررہی تھی دھوکہ دیا جائے۔

اُسی دن شام کو اخبارات میں یہ بھی چھپ گیا کہ مسعود حسن کے والد لاہور سے غائب ہوگئے۔ مسعود کو یہ خبر بذریعۂ تار سہ پہر کو مل چکی تھی۔

باب ۱۱

لاہور کا سفر

باپ کی گمشدگی کی خبر نے مسعود کو بیقرار کر دیا۔ بہرام کی دھمکی سے مرعوب ہو کے اُس نے وعدہ تو کر لیا کہ مضمون اصل صورت میں نہ چھپے گا لیکن بعد میں غور کیا تو اُسے ہرگز یقین نہ ہوتا تھا کہ لاہور جیسے مقام، اور وہ بھی فوجی پہرے، اُس کا باپ غائب کر دیا جائیگا اُسنے اپنے دوستوں کو سخت تاکید کر دی تھی کہ اسکے والد کو کبھی تنہا باہر نہ جانے دیا جائے اور اگر کوئی خط بھی آئے تو بغیر پڑھے نہ دیا جائے۔ ان تدابیر کے سامنے بہرام کی کیا مجال تھی کہ اسکے باپ کو لے بھاگے لیکن لاہور کے تار نے ثابت کر دیا کہ بہرام کے مقابلہ میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی۔ اپنے باپ کا خیال کر کے بے اختیار رونے لگا۔ جب دل کی بھڑاس نکل گئی تو فوراً ارادہ کیا کہ تلاش میں نکلنا چاہیے۔

دوسرے دن اسٹیشن پر پہونچا اور لاہور روانہ ہوگیا۔

سہارنپور کے اسٹیشن پر ہوٹل سے کھانا کھا کر باہر نکلا اور اخبار خرید کے پڑھنے لگا۔ اس اخبار میں بہرام کا حسب ذیل خط تھا:۔

اڈیٹر صاحب انیس تسلیم۔

دوسرے لوگوں کی طرح زمانہ کی روش سے مجھے بھی بڑی شکایت ہے۔ اس زمانہ میں کوئی راز ہو چھپ نہیں سکتا۔ قومی اور ملکی معاملات کا پبلک میں آنا ایک حد تک جائز بھی ہوسکتا ہے لیکن قیامت ہے کہ اب تو شخصی ور ذاتی معاملات تک اخباروں کے

ذریعہ سے طشت ازبام ہوجاتے ہیں۔ اگر ملک کے باا ثر اور مقتدر لوگوں کے ساتھ یہ سلوک
ہوتا اور اُنکی خانگی زندگی اہلِ دنیا کے لیے سبق آموز سمجھ کر پبلک میں لائی جاتی تو بھی
مضایقہ نہ تھا مگر مجھ جیسے گمنام و بے نشان آدمی کے ذاتی اور خانگی حالات اخبارات میں
شائع ہونا زمانہ کی بدمذاقی کی بین دلیل ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ مسعود حسن کی ذہانت حیرت انگیز ہے
اور اُسنے جو حالات اخبار میں شائع کیے ہیں صحیح ہیں یہ بھی سچ ہے کہ فیروزہ بائی زندہ
و سلامت ہے۔ یہ قیاس بھی درست ہے کہ فیروزہ بائی میرے دل کی مالک ہے اور اگرچہ میں
ہزار جان سے فدا و شیدا ہوں لیکن بدقسمتی سے وہ ابھی تک اُن تکالیف کو نہیں بھولی
ہے جو گذشتہ چند ماہ میں اُسے پہونچی ہیں۔ یہ سب صحیح لیکن ایک معمولی آدمی، وہ بھی
چور اور جرائم پیشہ کی خانگی باتوں کو لیلیٰ و مجنوں کے قصہ کی طرح چاردانگ عالم میں
مشتہر کرنا کس مذہب میں جائز ہے؟ اور اس سے پبلک کا کیا فائدہ متصور ہے؟"

"جو ہونا تھا ہوچکا، فیروزہ بائی میرے قبضہ میں ہے مجھے سوا اسکے کوئی کام نہیں
کہ جس طرح ہوسکے اُسکے سخت دل کو نرم کرکے اپنی طرف مائل کروں مجھے وقت اور
فرصت درکار ہے اور سوائے اس شغل کے اِس دلچسپ دنیا میں مجھے اور کوئی دلبستگی
نہیں ہے۔ اس لیے میں بہت درخواست کرتا ہوں کہ دنیا مجھے مردہ سمجھ لے۔ میں سوا
ایک خیال کے اور سب چیزوں کو خیرباد کہہ چکا ہوں۔ اور کسی سے کوئی سروکار رکھنا
نہیں چاہتا۔ صرف ایک خواہش پر دم دیتا ہوں وہ یہ کہ کسی طرح فیروزہ بائی کو خوش
کروں۔ اگر اسکی خواہش ہو تو دنیا کے جواہرات اور خزانوں کا تو ذکر ہی کیا۔ آسمان کے
تارے توڑ کر اُسکے قدموں پر رکھنے کے لیے تیار ہوں۔ آخرکار ایک دن آئیگا اور وہ میری
محنت کی داد دیگی اور میں دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب شخص ہونگا۔

لیکن یہ سب جب ہی ہو سکتا ہی کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے میں دنیا کو
ترک کر چکا ہوں دنیا مجھ سے کوئی سروکار نہ رکھے میں اپنے دشمنوں کے سامنے کان
پکڑتا ہوں اور ہاری مانتا ہوں۔ اسی کے ساتھ میں ڈنکے کی چوٹ انھیں متنبہ کرتا
ہوں کہ اگر اس اعلان کے بعد بھی میرے دشمن میرا پیچھا نہ چھوڑینگے تو اسکا خمیازہ
انھیں بھگتنا پڑیگا۔ یاد رہے کہ بہرام کا انتقام نہایت خوفناک ہوگا میں شکر گزار ہونگا اگر اس تحریر پہ
حکام دہلی توجہ فرما کر ایک بیگناہ آدمی یعنی دادا بھائی کو قید خانہ سے
رہائی دینگے۔ دادا بھائی غریب بالکل بے قصور ہی۔ اصل واقعہ یہ ہی کہ دادا بھائی کے ذریعہ
سے مسٹر سہراب جی نے اپنے نادر الوجود بتوں اور کتبوں کے تمام ذخیرے فروخت کرنیکا
انتظام کیا تھا اور نقلی بت اور کتبے اُنکے بجائے رکھدیے تھے۔ اگر کوئی شخص قصوروار
ہی تو مسٹر سہراب جی۔ دادا بھائی بمبی کے مشہور کروڑپتی پی، سی، چکلی والے کا سکریٹری
ہی اور اپنے آقا کے حکم سے سہراب جی سے خرید و فروخت کرتا رہا تھا۔ اتفاق سے اس نے
آغا مرزا کی معرفت یہ خط و کتابت کی اور آغا مرزا کی جیب میں لاکھوں روپیہ پہونچگیا۔
میں اپنے دوست آغا مرزا کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔

خاکسار

بہرام

مسعود یہ خط پڑھکر سوچنے لگا کہ ان بھولے بھالے الفاظ میں کوئی راز پوشیدہ
ہی اور بہرام اُسے دھوکے میں ڈالنا چاہتا ہی، کیونکہ جب کبھی بہرام اخبارات میں
کوئی تحریر شائع کرتا ہی تو وہ کبھی مطلب سے خالی نہیں ہوتی۔ اپنے درجہ میں بیٹھکر گھنٹوں
غور کرتا رہا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا پھر اپنے والد کا خیال کرکے آبدیدہ ہوگیا اور اُسے

کہنے لگا کہ بہرام جیسے آدمی سے مقابلہ کرنا واقعی حماقت ہے اسپر فتح پانا ایسا ہی مشکل ہے جیسا چاند اور سورج کو مٹکے میں بند کرنا ہے۔"

لاہور کا اسٹیشن آیا اور مسعود سیدھا سردار اشرف خاں صاحب رسالدار میجر کے بنگلہ پر جہاں اُسکے والد مقیم تھے جا پہونچا۔

"سردار صاحب! کہیے ابا جان خیریت سے ہیں"

"مسعود! میں سخت نادم اور شرمندہ ہوں لیکن یہاں آؤ تو سب حال بیان کروں"

سردار صاحب مسعود کو کمرے میں لے گئے۔ چائے منگائی۔

"سردار صاحب جلد بتائیے میرے والد کہاں ہیں"

"تمھارے والد کی گمشدگی ایک عجیب حیرت انگیز واقعہ ہے۔ رات کے وقت کوئی متنفس قلعہ میں نہ آسکتا ہے نہ باہر جا سکتا ہے اور تمھارے کہنے کے بموجب میں نے پہرہ والوں کو سخت تاکید کر دی تھی۔ کسی اجنبی کا قلعہ میں رات کے وقت آنا غیر ممکن ہے۔ پرسوں جس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب موجود نہیں ہیں ہر طرف ٹیلیفون و یا اسٹیشن پر خاص آدمی بھیجے۔ خود میں ہر طرف دوڑا پھرا لیکن کچھ نہیں معلوم کہ کیا اسرار ہے۔ صرف یہ تصویر کمرے میں ملی ہے"

"ہائیں یہ تو میرا فوٹو ہے! اسکی پشت پر عبارت بھی میرے ہاتھ کی سی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن میں نے ہرگز یہ تصویر ابا جان کو نہیں بھیجی"

"میں نے بھی یہ تصویر کمرے میں پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ ہر وقت تمھارا ذکر ہوا کرتا تھا اگر یہ تصویر پہلے سے انکے پاس ہوتی تو مجھے ضرور دکھاتے"

مسعود دیر تک فوٹو کو دیکھتا اور غور کرتا رہا

"میرا جہاں تک خیال ہے اس تصویر کے ذریعہ سے ابا جان کو دھوکہ دیا گیا۔"

"لیکن کسی غیر آدمی کا میرے گھر میں آنا کب ممکن تھا جو یہ تصویر اُن تک پہونچی۔"

"خیر یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔"

"آپ کہتے تھے کہ رات میں قلعہ سے باہر جانا ممکن نہیں تھا اسلیے ابا دن میں باہر گئے ہونگے۔ دیکھو اس تصویر کی پشت پر لفظ شالا مار لکھا ہے۔ غالباً اس تصویر کو دکھا کر ابا جان سے یہ کہا ہوگا کہ ایک شخص جس کی یہ تصویر ہے بُلا رہا ہے۔ ابا جان شالا مار گئے اور وہاں بہرام کے دوستوں نے انھیں پکڑ لیا اور کہیں لے گئے۔"

"وہ دن بھر کہیں نہیں گئے۔"

"مہربانی کرکے اسقدر تصدیق کر لیجیے، جو لوگ دن میں پہرہ پر تھے اُن سے پوچھیے۔"

سردار اشرف خاں اس لڑکے کی ذہانت پر بہت متعجب تھے اور پہرہ والوں سے پوچھنے کے لیے کوارٹر گارڈ کی طرف چل دیے۔

سردار صاحب کا چھوکرہ کوئی تیرہ چودہ سال کی عمر جو گھر میں سے پان اور چائے وغیرہ لایا تھا اُن کی باتوں کو غور سے سُن رہا تھا اور مسعود سے آنکھیں چار نہ کرتا تھا۔

مسعود تاڑ گیا اور اِدھر سردار صاحب کمرے سے باہر گئے کہ مسعود نے پوچھا۔

"کیوں میاں لڑکے یہ سب تمھاری مہربانی ہے، تم نے اس تصویر کو ابا جان تک پہنچایا۔"

لڑکا خاموش نیچی نظر کیے کھڑا رہا اور کچھ نہ بولا۔

"اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں، مجھے سب معلوم ہے۔ تم روپیہ کے لالچ میں آ گئے لیکن تمھیں یہ کیا خبر تھی کہ وہ غائب ہو جائیں گے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ لو یہ روپیہ

مٹھائی کھانے کے لیے۔ اب یہ بتاؤ کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟"

"مجھے مجھے کچھ نہیں معلوم۔ تین آدمی مجھے ٹھنڈی سڑک پر ملے، موٹر پر سوار تھے میں سودے کو باہر گیا تھا۔ انکی موٹر کار دیکھنے لگا، ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا سوار ہونا چاہتے ہو؟ میں نے کہا ہاں۔ میں کبھی موٹر پر سوار بھی نہیں ہوا تھا مجھے سوار کر کے خوب سیر کرائی اور کہا کہ دیکھو ہم نے تمھیں موٹر پر سیر کرائی اب تھوڑا سا ہمارا کام ہے۔ دوسرے دن میں پھر گیا تو اُن لوگوں نے مجھے تصویر دی اور کہا کہ مولوی صاحب سے ضروری کام ہے جس کی یہ تصویر ہے شالامار میں ملنا چاہتا ہے میں نے تصویر آپ کے والد کو دیدی، اِس میں میرا کیا قصور ہے"

"میں کب کہتا ہوں تمھارا قصور ہے، صرف یہ بتاؤ کہ کسی جگہ کا نام موٹر والے لیتے تھے یا نہیں"

"کچھ خیال نہیں۔ جب میں اِن کے ساتھ سیر کو گیا تو وہ لوگ باتیں تو بہت آپس میں کرتے تھے"

"آخر کار کس جگہ کا نام لیا تھا"

"ہاں کچھ غازی آباد سا کہتے تھے"

اس کا سُننا تھا کہ مسعود نے گاڑی مانگی اور سردار صاحب کی واپسی کا انتظار بھی نہ کیا اور فوراً اسٹیشن پہونچا۔ گاڑی کا وقت قریب تھا ٹکٹ خرید گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اب اُسے یقین تھا کہ اُسکے والد دہلی سے کچھ دور نہیں گئے۔

باب ۱۲

تلاش

دوسرے دن ایک نوجوان پنجابی وضع کے کپڑے پہنے۔ بائیسکل پر سوار جس کے پیچھے ایک چھوٹا سا فوٹو لینے کا کمرہ بندھا تھا شاہدرہ کے پل سے گذر کر غازی آباد کی طرف جا رہا تھا۔ یہ مسعود تھا جو فوٹو گرافی اور مصوری کا بہانہ کر کے اپنے باپ کی تلاش میں نکلا تھا۔ غازی آباد پہنچ کر ایک ضروری تار روانہ کرنے کی غرض سے تار گھر پہونچا، تار بابو سے باتیں کرنے پر معلوم ہوا کہ تین دن ہوئے ایک موٹر کار جس میں دو جوان اور ایک سن رسیدہ آدمی سوار تھا یہاں سے گذری تھی۔ دوسرے روز اُن میں سے ایک شخص تار کے انتظار میں آیا، اُس کے نام تار تھا لے کر چلا گیا۔

مسعود کو کامل یقین تھا کہ موٹر کار میں اسکا باپ تھا۔ سرائے میں یکوں کے اڈے پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ تین دن ہوئے چند آدمی ٹانگہ میں سوار ہو کر دوسنہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ موٹر کار تھوڑی دیر بعد واپس چلی گئی۔ ہانکنے والے کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک اجنبی آدمی نے دو ناکرایہ اس شرط پر دیا تھا کہ ٹانگہ والا ساتھ نہ جائے۔ اجنبی خود ہانک کر لے گیا اور چار پانچ گھنٹہ بعد ٹانگہ واپس کر گیا۔

اس تفتیش سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسعود کا باپ غازی آباد سے کچھ زیادہ دور نہیں گیا ہے مسعود خوش تھا اور دل میں کہتا تھا "اب کیا ہے! ابّا جان یہیں کہیں ہیں اور تھوڑی دیر میں انھیں اِن ظالم قزاقوں کی قید سے رہائی مل جائے گی۔ ابّا جان مجھے دیکھکر کس قدر خوش ہوں گے، نہ صرف ابّا جان آزاد ہونگے بلکہ تعجب نہیں کہ اس جگہ

بینی مادھو اور وقار حسین بھی مل جائیں اور انھیں بھی اس قید سے نجات ملے میں سمجھتا ہوں کہ نابکار بہرام نے فیروزہ بائی کو بھی یہیں کہیں رکھا ہوگا۔ بہرام اب تمھاری سب قلعی کھل جائے گی۔"

تحصیل جاکر ایک نقشہ لیا اور سرخ پنسل سے خاکہ کھینچکر غازی آباد کے آس پاس کے مقامات یکے بعد دیگرے احتیاط کے ساتھ تلاش کرنا شروع کئے۔ ایکدن دو دن، ایک ہفتہ اس طرح گذر گیا۔ ہر ایک گانوں میں جاتا مکھیا اور پٹواری سے باتیں کرتا کھیت میں ہل چلانے والوں اور جنگل میں گائے بھینس چرانے والوں سے پوچھتا پھرا لیکن کچھ پتا نہ چلا آخر کار پندرہ بیس دن ضائع ہو گئے۔ دو دن ڈاسنہ اور دو دن شاہ دارا ٹھہرا اور مارا مارا پھرا لیکن نتیجہ کچھ نہیں۔ بالآخر مسعود نے مایوس ہو کر دہلی کا راستہ لیا۔ دہلی پہونچ کر کئی روز کے آئے ہوئے خط ملے ایک خط بے ٹکٹ کا تھا، مسعود دیکھکر جوش سے کانپنے لگا۔ پتہ اُس کے والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ بڑی بے صبری سے لفافہ چاک کیا اندر سے جو خط نکلا وہ بھی اُسکے والد کے ہاتھ اب کوئی شک باقی نہیں تھا مضمون یہ تھا:

برخوردار مسعود سلمہٗ۔ دُعا۔

معلوم نہیں کہ یہ خط جو بڑی امیدوں کے ساتھ لکھ رہا ہوں تمھارے پاس پہونچیگا یا نہیں۔ یہاں مجھے کوئی تکلیف نہیں لیکن تمھیں دیکھنے کو ترٹپتا ہوں۔ کب تمھاری صورت دیکھنی نصیب ہوگی۔ لاہور سے روانگی کے وقت قزاقوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی، موٹر کار تمام رات چلتی رہی لیکن مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کس راستہ سے سفر طے ہوا میں دریا کے قریب ایک خوش قطع پرانے مکان میں ہوں۔ دوسری منزل پر

میرا کمرہ واقع ہی اسکی دو کھڑکیاں ہیں۔ ایک کھڑکی بیل سے ڈھکی ہوئی ہے۔ شام کو تھوڑی دیر کے لیے باغیچہ میں چہل قدمی کی اجازت ہے۔ کھانے پینے کے لحاظ سے بڑی فیاضی کے ساتھ برتاؤ ہوتا ہے لیکن میری روح آزادی کے لیے تڑپتی ہے۔ یہ خط لکھکر کھڑکی سے باہر اس امید پہ پھینکتا ہوں کہ شاید کوئی راہگیر اِدھر آنکلے اور لفافہ ڈاک میں ڈال دے یہ معلوم نہیں کہ میری وجہ سے تم کس قدر تکلیف اور پریشانی میں ہوگے لیکن خدا کے لیے اپنے آپ کو کسی خطرہ میں نہ ڈالنا۔

راقم

محمود

مسعود خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا، مُہر دیکھی تو سلیم گڈھ کی۔ جیب سے نقشہ نکالکر میز پر پھیلایا تو سلیم گڈھ کو جمنا کے داہنے کنارہ پایا۔ اپنے باپ کی تلاش میں مسعود سلیم گڈھ سے دو تین بار گذرا تھا لیکن اسکی تلاش زیادہ تر دریا کے دوسرے کنارے تک محدود رہی اب اُسے خیال آیا کہ غازی آباد تک موٹر کار میں جانا محض دھوکا تھا مسعود سلیم گڈھ پہونچا۔ وہاں کے محرر ڈاکخانہ سے پہلے ملاقات ہو چکی تھی اسیر مسعود کو کافی بھروسہ تھا۔ اُس سے خط کا ذکر کیا۔

محرر "خط سنیچر کے دِن ڈاک میں ڈالا گیا ہی"

مسعود "جی ہاں"

محرر "اب مجھے خیال آیا سنیچر کے دن لال شاہ فقیر میرے پاس آیا اور پوچھا کہ منشی جی بغیر ٹکٹ کا لفافہ ڈاک خانہ میں ڈالا جائے تو پہونچیگا یا نہیں میں نے جواب دیا کہ پہونچ جائیگا صرف اتنا ہوگا کہ پانے والے کو دوگنا محصول دینا ہوگا"

مسعود "لال شاہ رہتا کہاں ہی؟"

محرر: لال شاہ دریا کے کنارے ایک مٹھی مین رہتا ہی اور جس گانوں میں بازار لگتا ہی، مانگنے کھانے کو چلا جاتا ہی۔ کیا میں آپ کے ساتھ وہاں تک چلوں؟"

فقیر کی مٹھی ایک اونچے ٹیلے پر واقع تھی۔ سامنے چھوٹا سا باغیچہ تھا ایک طرف دو ایک ٹوٹے مکان تھے۔ قریب پہونچے تو ٹوٹے مکان سے دو تین جنگلی کبوتر زور کے ساتھ اُڑے لیکن ایک بڑا کُتا جو وہاں پڑا تھا نہ تو بھونکا نہ اپنی جگہ سے ہلا۔

مسعود نے اس پر تعجب کیا اور پاس جاکر دیکھا تو بالکل مُردہ پایا جلد جلد قدم بڑھا کے مٹھی کی طرف گئے۔ دروازہ کُھلا تھا۔ بلا تکلف اندر چلے گئے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ فقیر معمولی کپڑے پہنے ہوئے پیال کا بستر اجائے بے خبر سو رہا ہی۔

محرر: "شاہ جی، شاہ جی، کیا سوتے ہو؟"

مسعود: "کُتے کی طرح یہ بھی مر گیا۔"

فقیر کے ہاتھ ٹھنڈے اور چہرہ زرد تھا لیکن دل آہستہ آہستہ حرکت کر رہا تھا اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو کسی زخم یا چوٹ کا نشان بدن پر نہ پایا ہر چند کوشش کی لیکن فقیر کو ہوش نہ آیا۔ مسعود گانوں جاکر ایک بید حکیم کو لایا مگر اُس کی کوشش بھی بیکار گئی حکیم نے اتنا بتایا کہ فقیر سو نہیں رہا ہی بلکہ کسی طلسم یا بیہوشی کی دوا کا اثر ہی۔

مسعود دم بھر کے لیے فقیر کے پاس سے نہ اُٹھا۔ آدھی رات کے قریب فقیر کا دل کسی قدر تیزی سے حرکت کرنے لگا، بدن کی حرارت بڑھی اور صبح ہوتے فقیر اُٹھ بیٹھا۔ اِدھر اُدھر ٹہلا۔ باغیچہ میں گیا مُنھ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا لیکن مُنھ سے کچھ نہ بولتا تھا اب معلوم ہوا گونگا ہی سنتا ہی نہیں ہی۔ تمام دن اس طرح گذرا۔ دوسرے دن صبح کو شاہ جی نے مسعود سے پوچھا "تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اب لال شاہ کو کسی اجنبی کا اپنے پاس ہونا محسوس ہوا۔ تمام دن مسعود سے باتیں کرتا رہا لیکن جب مسعود بیہوش ہونے سے پہلے کے واقعات کی نسبت سوال کرتا تو کچھ جواب نہ دیتا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہلے کے واقعات اُس کے دل سے حرفِ غلط کی طرح محو ہو گئے، مسعود کی مایوسی کی کوئی حد نہ تھی۔ اس فقیر کے دل میں سب کچھ تھا لیکن اُس کی زبان تک آنے کی کوئی امید نہ تھی۔ شاہ جی کی آنکھوں نے اُن دیواروں کو دیکھا تھا جس میں اس کا باپ مقیّد ہے۔ لیکن وہ وہاں تک اُس کی رہنمائی کرنے سے قاصر تھا اُس کے ہاتھ نے مولوی محمود کا خط اُٹھا کر ڈاک میں ڈالا تھا لیکن اُنگلیوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ قیدخانہ کی طرف اشارہ ہی کر سکیں۔ خاموشی اور نادانی کی دیوار ایسی حائل تھی کہ مسعود عبور کرنے سے معذور تھا اور کوئی شکل ہوتی تو سو تدبیریں ممکن تھیں لیکن چپ کا علاج آسان نہ تھا۔ ان سب واقعات میں بہرام کی دستکاری نظر آتی تھی حفظ ماتقدم کی یہ سب تدبیریں سوائے اُس زیرک اور ہوشمند بہرام کے اور کون عمل میں لاسکتا تھا۔ اُسکو معلوم ہو گیا تھا کہ مولوی محمود نے کوئی پیام اپنے بیٹے کو بھیجا ہے اور کوئی دم میں مسعود وقعہ پر آ موجود ہوگا۔ اس لئے اُس نے یہ انتظام کیا کہ شاہ جی کا دماغ معطل کر دے۔ اب سوائے اسکے کوئی چارہ نہ تھا کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ جمعہ کے دن لال شاہ کس گاؤں میں گیا تھا شاید اُسکے راستہ میں وہ مکان مل جائے جسمیں اُسکا باپ قید تھا۔ جمعہ کے دن خوشحال پور کا بازار تھا۔ اس گاؤں کے دو راستے تھے ایک سڑک سے جو کسی قدر چکر سے گئی تھی، دوسرا جنگل میں ہو کر۔ مسعود سڑک کے راستے سے خوشحال پور پہونچا اور ایک چوپال پر ٹھیکر سستانے لگا، تھوڑی دیر میں لال شاہ اپنی جھولی کندھے پر ڈالے گاؤں میں آیا اور دو چار دروازوں پر بھیک مانگ کر گاؤں سے پھاٹک پور کی طرف روانہ ہوا۔ مسعود نے بھی فاصلے سے اسکے پیچھے

چلا تھوڑی دور چل کر مسعود نے محسوس کیا کہ اُسکے علاوہ ایک اور آدمی شاہ جی کی نگرانی کر رہا ہے۔ شاہ جی اور مسعود کے بیچ میں ایک آدمی سڑک پر جا رہا تھا جب لال شاہ ٹھہرتا یہ آدمی بھی ٹھہر جاتا۔ مسعود کو پورا یقین تھا کہ یہ آدمی بہرام کے گرگوں میں سے ہے اسکا دل تیزی کے ساتھ حرکت کرنے لگا۔ دیکھیے اب کیا گُل کھِلتا ہے۔

تینوں آدمی یکے بعد دیگرے سہاگ پور پہونچے۔ مسعود اور اجنبی لال شاہ کو ایک لمحہ کے لیے نظر سے علیحدہ نہ ہونے دیتے تھے۔ لال شاہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک گاؤں میں گھومتا اور مانگتا پھرا۔ پھر بازار میں آکر ضرورت کی چیزیں خریدیں اور دریا کی طرف روانہ ہوا۔ گھاٹ پر پہنچ کر اجنبی رُک گیا اور جب اطمینان ہو گیا کہ شاہ جی دور جاکر نظر سے اوجھل ہو گیا تو پگڈنڈی کے راستہ سے جنگل کی طرف چلدیا۔ مسعود نے کسی قدر تامل کیا کہ کس کا پیچھا کرے۔ آخر کار شاہ جی کا پیچھا چھوڑ اجنبی کے راستہ ہولیا اور دل میں کہنے لگا کہ یہ شخص صرف معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شاہ جی کس طرف جاتے ہیں۔ اب یہ خود غالباً قیدخانہ کی طرف جائیگا۔ وہ خوش تھا کہ اب منزلِ مقصود قریب معلوم ہوتی ہے۔

اجنبی گھنے جنگل میں گھُس گیا اور کچھ دور جنگل سے نکل کر ایک ٹیلہ پر پھر نظر آیا، پھر غائب ہو گیا۔ جسوقت مسعود درختوں کی آڑ سے باہر نکلا تو ہر طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے صبری کے ساتھ دیکھتا تھا لیکن اجنبی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کشمکش و پیچ میں تھا کہ یکایک ایک ٹیلہ کے پیچھے [illegible] سے ایک دیوار نظر آئی۔ فوراً ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا اور غور سے دیکھنے لگا، دائیں جانب دور تک ایک دیوار چلی گئی تھی اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کچھ برج سے سی نظر آتی [illegible] جس سے اُسے یقین ہوا کہ یہ کوئی پرانی گڑھی ہے جس کے چاروں دیواروں کے سامنے مٹی کا ڈھیر [illegible] ہو نہ ہو اس کا باپ اسی دیوار کے پیچھے مقید ہو۔ اب کیا تھا

مسعود کو وہ جگہ معلوم ہو گئی جہاں بہرام اپنے قیدیوں کو چھپایا کرتا ہے۔
مجھکے مجھکے پیچھے ہٹا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا گنجان جھنڈ میں پہونچا اور ایک
بڑے درخت پر چڑھ کے اُس نے گڑھی کا نظارہ شروع کیا، چار دیواری کے اندر کچھ
مسمار مکانات نظر آئے لیکن ایک جانب پرانی وضع کا دو منزلہ مکان بھی تھا۔ مسعود کو
پورا یقین ہو گیا کہ یہی وہ مکان ہے جس کا حوالہ اُس کے باپ نے اپنے خط میں دیا تھا
مسعود نے خیال کیا "اب واپس چل کر خاموشی کے ساتھ سوچنا چاہیئے کہ بہرام پر کس
انداز سے حملہ کیا جائے۔ اب بہرام میری مٹھی میں ہے ایسا نہ ہو کہ نکل جائے۔"
گھاٹ کے قریب پہونچکر دو گوجرنیاں ملیں جو دودھ بیچ کر لوٹ رہی تھیں اُن سے پوچھا:
"اس جگہ کا کیا نام ہے؟"
"فیروزآباد"
اس کا سننا تھا کہ مسعود کے بدن میں سنسنی سی آگئی یہی تو لفظ تھا جو اُس کاغذ
میں لکھا تھا جسے سالگرام چھین کرلے گیا تھا۔ اُس نے اپنے جوش کو ضبط کر کے پوچھا۔
"جنگل میں جو عمارت ہے اُس کا کیا نام ہے؟"
"نیلی چھتری پرانا نام ہے اب اُسے چتر گڑھی کہتے ہیں۔"
فیروزآباد! اور نیلی چھتری! اب کیا تھا اب تو اُس ہندسوں والی تحریر کی کنجی
مل گئی! فتح اور کامیابی کچھ دور نہیں! نیلی چھتری کے اعداد ۱۰۱ کے برابر ہوتے
ہیں جو تعویذ کے نیچے درج ہیں! مسعود کی خوشی کا اندازہ نہ تھا۔

باب ۱۳

قید سے رہائی

مسعود کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی پولیس کو خبر کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اسلیے تن تنہا حملہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اول تو اُس کے پاس سوائے قیاسات کے اسکا کوئی ثبوت نہ تھا کہ نیلی چھتری بہرام کا قید خانہ ہی۔ علاوہ اس کے پولیس کی سُست رفتاری اور بے ڈھنگے پن سے معاملہ خراب ہوجانے کا احتمال تھا۔ بہرام ہوشیار ہوکر سو تدبیریں کریگا اور اُسکا رہاتھ سے نکل جائے گا۔

رات خوشحال پور میں بسر کی صبح سویرے جنگل میں جاکے پنجابی مصور کا بھیس بدل لیا تھوڑی دیر گھوم پھر کے خوشحال پور کے زمیندار کے یہاں پہونچا۔ کارندہ مکان پر موجود تھا مسعود نے اپنے آنے کی وجہ ظاہر کی کہ اُسے تصویر کشی سے شوق ہی۔ خوشحال پور کے قرب و جوار کے مناظر، دریا کی قربت اور دیہات کی خاموشی اُسے بہت مرغوب ہی اور اگر کوئی مکان رہنے کے لیے ملجائے تو اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ چند مہینے یہاں بسر کرے۔ مصوری کے لیے ایسی جگہ نہایت مناسب ہی۔ کارندہ نے دو ایک مکانوں کا پتہ دیا مسعود نے باتوں باتوں میں کہا کہ کوئی شخص کہتا تھا کہ چترگڈھی یا نیلی چھتری بھی مل سکتی ہی

کارندہ "نیلی چھتری میرے ایک دوست کی ملکیت ہو لیکن سر دست اُس کا ملنا دشوار ہی"

مسعود " دشوار کیوں! کیا تمھارے دوست خود رہتے ہیں؟"

"میرے دوست اُس میں رہا ضرور کرتے تھے لیکن اُنکی ضعیف ماں کو یہاں کا رہنا پسند نہیں آیا اور ایک سال ہوا وہ لوگ چلے گئے۔"

"کیا کوئی اور وہاں رہتا ہے؟"

"ایک بنگالی امیر نے اُسے کرایہ پر لے لیا ہے اور خود اُسمیں رہتا ہے۔"

"اُس کا نام کیا ہے اور کس صورت و شکل کا ہے؟"

"نام آسوتوش چٹرجی ہے۔ صورت و شکل کا حال مجھے نہیں معلوم۔ میں نے اُسے خود کبھی نہیں دیکھا وہ گڈھی سے کبھی نہیں نکلتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ کتابوں کے مطالعہ اور مضمون نویسی میں دن بسر کرتا ہے۔ اور رات کے وقت کبھی کبھی موٹر گاڑی پر سوار ہو کر دہلی کی طرف جایا کرتا ہے۔ سودا سُلف ایک بڈھا سودیا خرید تا ہے لیکن وہ کبھی کسی سے بات چیت نہیں کرتا۔ عجب مراقی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

"مہربانی کرکے مجھے اپنے دوست کا پتہ دیجیے۔ اگر ہو سکا تو میں گڈھی کرایہ پر لونگا، یہاں کا منظر مجھے بہت پسند ہے۔"

"چھپت رائے جتیلی تبر دہلی"

مسعود نے فوراً دہلی کا راستہ لیا۔ دو تین مرتبہ جتیلی تبر گیا مگر چھپت رائے مکان پر نہ ملا۔ تیسرے دن چھپت رائے سے ملاقات ہوئی۔ چھپت رائے پچیس برس کی عمر کا آدمی تھا۔ شروع سے خوش مزاج معلوم ہوتا تھا۔ مسعود نے چھپت رائے کو اپنا شریف صورت اور [illegible] سے فوراً [illegible] لیا کہ یہ شخص [illegible] کر سکتا ہے [illegible] ملاقات، باتیں کرنا شروع کیا کہ دو [illegible] اور [illegible] سے [illegible]

مسعود "مجھے پورا یقین ہے کہ میرا باپ اس گڈھی میں مقید ہے اور غالباً اور لوگ بھی۔ براہ مہربانی یہ بتلائیے کہ آپ اپنے کرایہ دار آسوتوش چٹرجی کی بابت کیا جانتے ہیں؟"

چھمپت رائے "کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ اگلے سال لاہور میں آسوتوش سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ نیلی چھتری میری ملکیت ہے تو اُس نے اس خیال سے کہ وہاں رہ کر دہلی کے آثار قدیمہ کی تحقیقات عمدگی سے ہو گی، کرایہ پر لے لی۔ آسوتوش نوعمر آدمی ہے اور اُس کی آنکھوں میں ذہانت اور سنجیدگی کوٹ کوٹ کے بھری ہے، گھونگر والے بال گورا رنگ"

"اُسکے داڑھی ہے یا نہیں؟"

"داڑھی ہے لیکن چار انگشت سے زیادہ نہیں ہے۔ کپڑوں کا زیادہ شوقین نہیں معلوم ہوتا۔ وضع سے بھاری مولوی معلوم ہوتا ہے"

مسعود (جوش سے) "بیشک وہی ہے! وہی ہے! یہ بیشک اُسی کا حلیہ ہے۔ میں نے اسی ہیت کذائی میں اُسے دیکھا ہے"

"وہ کون ہے؟"

"سوائے بہرام کے اور کون ہو سکتا ہے؟"

چھمپت رائے [illegible] انہیں بخوبی معلوم تھیں اور یہ

بھی جانتا تھا [illegible] بہرام [illegible] چھمپت رائے

[illegible] نیلی چھتری [illegible]

[illegible] کیا تھا اور [illegible]

تلاش میں تھا، اب خریدار جلد مل جائیگا۔ لیکن ....."

"لیکن کیا؟"

"آپ کو بڑی احتیاط اور دوراندیشی سے کام کرنا پڑیگا اور پولیس کو اسکی کچھ خبر نہ ہونی چاہیے۔" اگر میرا کرایہ دار بہرام نہ ہوا تو پولیس سے پیچھا چھوڑانا مشکل ہو جائے گا۔"

"میں رات کو تنہا جاؤنگا۔ پولیس کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائیگی۔ احاطہ کی دیوار پر چڑھ کے اندر پہونچونگا اور باغ میں چھپ جاؤنگا۔"

جمیت رائے نے فوراً قطع کلام کیا۔ "کیا کہا؟ رات کے وقت چہاردیواری پر چڑھنا آسان کام نہیں۔ اگر چڑھ بھی گئے تو اُس طرف دو خوفناک کُتوں سے پیچھا چھوڑانا دشوار ہو جائے گا۔ یہ کُتے میرے ہیں اور کسی اجنبی کا رات کے وقت گڈھی میں داخل ہونا نہایت مشکل ہے۔"

"واہ یہ بھی کوئی بات ہے کُتوں کا انتظام کیا مشکل ہے؟ زہر سے اُنکا کام تمام ہو جائے گا۔"

"کتوں سے بچ بھی گئے تو اندر کس طرح داخل ہو گے؟ دروازے نہایت مضبوط ہیں تمام کھڑکیاں جنگلہ دار ہیں اور بفرض محال اندر پہونچ بھی گئے تو آپ کو راستہ کون بتائیگا۔ مکان کے کئی قطعہ ہیں اور چھوٹے بڑے بیسیوں کمرے اور تہ خانے ہیں۔"

"لیکن میں صرف اُس کمرہ میں جانا چاہتا ہوں جسکی کھڑکی پر بیل چڑھی ہے۔"

"یہ سب سہی لیکن اس کمرہ تک پہونچنے میں کم از کم تین زینوں پر چڑھنا ہوگا اور اجنبی کے لیے رات کے وقت بغیر آہٹ ہوئے راستہ ملنا آسان نہیں

میں آپ کو مکان کا نقشہ سمجھا سکتا ہوں۔ مگر پھر بھی راستہ بھولنے کا گمان غالب ہے۔ مکان پورا بھول بھلیاں ہے۔"

مسعود (ہنس کر) "پھر آپ بھی میرے ساتھ چلیے۔"

"میں نہیں چل سکتا مجھے چند دوستوں کے ساتھ مشاعرہ میں جانا ہے۔"

مسعود گاؤں میں جا کر رات کو حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ شام کے وقت چمپت رائے آیا اور پوچھنے لگا:۔

"کیا واقعی مجھے ساتھ لیجانا چاہتے ہو؟"

"بڑی مہربانی ہو اگر آپ چلیں۔"

"میں مشاعرہ میں صرف دل بہلاؤ کے لیے جانا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں یہ خیال کیا کہ اس دلچسپ اور خطرناک کام میں آپ کے ساتھ شریک ہونا شاید مشاعرہ سے بھی زیادہ پر لطف ہو۔ ایسی باتوں میں میرا دل بہت لگتا ہے اور شاید میری وجہ سے آپ کے کام میں آسانی ہو۔ مثلاً یہ دیکھو۔"

چمپت رائے نے ایک بڑی زنگ آلودہ کنجی مسعود کے سامنے ڈال دی۔

"اس سے کونسا دروازہ کھلتا ہے؟"

"گڈھی کے پشت پر جنگل کی طرف چھوٹا سا چور دروازہ ہے، جسے میں نے اپنے کرایہ دار کو نہیں بتایا ہے۔ اس راستہ سے بلا خوف اندر جا سکتے ہیں۔"

"ہمارے دشمن اس راستہ سے بھی واقف ہیں، جس آدمی کے پیچھے میں آ رہا تھا جنگل کے اس راستہ سے غائب ہو گیا، غالباً اسی دروازہ سے گیا ہو گا۔ بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔"

دوسرے دن خوشحال پور میں خانہ بدوشوں کا ایک ڈیرہ آیا۔ یہ لوگ مونگا اور موتی بیچتے اور چاقو اور چھری پر سان رکھتے تھے گاؤں کے باہر درختوں کے ایک جھنڈ میں مقیم ہوئے ایک گاڑی میں ان کا تمام اثاث البیت تھا۔ ہانکنے والا پھٹے چیتھڑے پہنے ہوئے تھا یہ چھپت رائے تھا اور اس کے ساتھ اسی قسم کے لباس میں میاں مسعود اور علی گڈھ کے دو اور کھلنڈرے حامد اور شفقت تھے۔

تین دن ادھر ادھر پھر کر ان لوگوں نے آمد و رفت کے راستوں اور گڈھی میں رہنے والے آدمیوں کی تعداد کا اندازہ کیا مسعود دیوار کے کنارے گشت کرتا ہوا چور دروازہ کی تلاش میں کئی بار گیا۔ بالآخر اسے دروازہ کی جگہ معلوم ہو گئی رات اُجیالی تھی۔

تیسرے دن شام ہی سے بادل آسمان پر چھا گئے اور خوب اندھیرا ہو گیا مشورہ سے یہ طے پایا کہ آج رات کو گڈھی میں گھسنا چاہئے۔

چاروں دوست جنگل کے راستے گڈھی کی پشت پر پہنچ گئے۔ مسعود نے بہت احتیاط کے ساتھ دروازہ کھولا خوش قسمتی سے دوسری طرف سے بند نہ تھا اور مسعود فوراً باغ میں داخل ہو گیا

چھپت رائے ۔ مسعود ٹھہرو آگے نہ بڑھو۔ میں بھی آتا ہوں۔ حامد اور شفقت تم دونوں یہیں ٹھہرو اور خوب ہوشیار رہو۔ اگر کوئی آگیا تو سیٹی بجا کر اطلاع کر دینا۔

[illegible]

[illegible]

کنارہ بدلی سے نکلا اور دونوں درختوں کی جڑ میں چھپ گئے۔ چاند کی روشنی میں
مکان صاف نظر آتا تھا۔ اُس کی منڈیروں پر جا بجا چھتری کی شکل کی چھوٹی چھوٹی
بُرجیاں بنی تھیں۔ شاید اسی سبب سے اس کا نام نیلی چھتری یا چتر گدھی رکھا گیا ہوگا
مکان کے اندر روشنی کا پتہ نہ تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ یکایک چمپت رائے نے زور
کے ساتھ مسعود کا ہاتھ دبایا۔

"ٹھہرو! خاموش!"

"کیا ہے؟"

"وہ کتے ادھر آ رہے ہیں!"

غراہٹ کی آواز آئی۔ چمپت رائے نے آہستہ آہستہ سیٹی بجائی جسے پہچان کر
وہ بڑے بڑے سفید کتے دُم ہلاتے ہوئے پاس آ گئے اور اپنے آقا کے قدموں میں لپٹ گئے۔

"ہیرا۔ موتی۔ شاباش یہیں بیٹھے رہو"

پھر وہ مسعود کی طرف متوجہ ہوا۔

"دراصل مجھے [illegible] کتوں کی طرف سے بڑا اندیشہ تھا۔ دیکھو
کیسے اپنے کتے ہیں۔ وہ میری شکل کو کیا پہچانتے ہیں۔ چلو آگے بڑھو"

[illegible] چمپت رائے نے آہستہ آہستہ ایک دروازے کو
ڈھکیلا [illegible] ہاتھ ڈال کر کنڈا کھول دیا اور اندر داخل ہوا۔
[illegible] ایک کمرہ تھا اور ڈیوڑھی کے صحن کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ
[illegible] چمپت رائے نے مسعود سے کہا۔
"[illegible] اوپر چڑھنے کے لیے زینہ [illegible]"

والد کے کمرہ کے سامنے ختم ہوتا ہے۔

مسعود نے کچھ جواب نہ دیا۔ تھر تھر کانپ رہا تھا، چمپت رائے کا ہاتھ پکڑ کے زمین پر بیٹھ گیا۔

"ہائیں مسعود! خیر تو ہے؟ کیا حال ہے"

"کچھ نہیں ... ذرہ دیر میں ٹھیک ہوا جاتا ہوں"

"آخر ہے کیا معاملہ ؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے"

"تم جیسا بہادر لڑکا اور ڈر؟"

معلوم نہیں کیا بات ہے۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے، اس خاموشی اور تاریکی سے میرے بدن میں سنسنی دوڑ رہی ہے ..... جب سے سالگرام نے مجھ پہ حملہ کیا ہے معمولی تشویش سے دل دھڑکنے لگتا ہے ..... شاید کمزوری کی وجہ ہے .. اب میں ٹھیک ہوتا جاتا ہوں .....

چمپت رائے نے ہاتھ پکڑ کر مسعود کو اٹھایا اور سہارا دے کر باہر صحن میں لے گیا صحن میں ہر طرف چھوٹے بڑے گملے رکھے تھے۔ دوسری جانب ایک چراغ ڈیوٹ پر ٹمٹما رہا تھا۔ لیکن اس کی روشنی ایک گملے سے رکی ہوئی تھی اور ان لوگوں تک نہ پہونچتی تھی۔ دروازہ پر ایک آدمی بندوق لیے کھڑا تھا۔ آہٹ پاکر اس نے اس طرف دیکھا اور بندوق چھتیائی۔

فوراً دونوں آدمی بڑے گملے کی آڑ میں چھپ گئے اور دیر تک خاموش رہے مسعود کا دل بلّیوں اچھل رہا تھا۔ پیشانی سے پسینہ کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

اس خاموشی سے سنتری کو بظاہر کچھ اطمینان ہو گیا اور اُس نے بندوق پھر نیچی کر لی لیکن اُس کا رُخ برابر اسی طرف رہا۔

بلا کی خاموشی تھی۔ ایک ایک منٹ گھنٹوں کے برابر تھا۔ دس پندرہ منٹ اس طرح گذرے۔ اتنے میں چاند بدلی سے نکلا اور اُس کی شعاع ایک کھڑکی کی دراز سے ہو کر مسعود کے قریب پڑی اور اُس نے محسوس کیا کہ دس منٹ اور گذر گئے تو تمام روشنی خود اُس پر پڑنے لگی۔

مسعود سہما جاتا تھا۔ دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ایک بار ارادہ بھی کیا کہ اُٹھ کر بھاگ جائے لیکن پھر خیال آیا کہ چمپت رائے ساتھ ہی کچھ ڈر کی بات نہیں ہے۔ نظر اُٹھا کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ چمپت رائے گملوں کی آڑ لیتا ہوا زمین پر آہستہ آہستہ کھسک رہا ہے اور بالکل سنتری کے پاس پہونچ گیا ہے۔

مسعود حیران تھا کہ چمپت رائے کا کیا ارادہ ہے؟ کیا سنتری کے پاس سے اکیلا گذر سکیگا؟ اتنے میں چاند پھر بدلی میں چھپ گیا اور یکایک کوئی چیز اندھیرے سے اُچھلی اور سنتری پر جا کودی۔ چراغ ڈیوٹ سے گر کر گُل ہو گیا اور ہاتھا پائی کی آواز آنے لگی مسعود دوڑ کے پہونچا۔ دو آدمی زینے کے نیچے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ اُس نے جھک کے دیکھنا چاہا کہ کیا ماجرا ہے لیکن ایک گھٹا کا ہوا سسکی کی آواز آئی اور ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور مسعود کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔

"سنتری تو ٹھنڈا ہوا چلو آگے بڑھو۔"

چمپت رائے کی آواز پہچان کر مسعود کو اطمینان ہوا۔ جلد جلد زینہ پر چڑھکے دوسری منزل پر پہونچے داہیں طرف بڑھے اور ایک بڑی غلام گردش میں پہونچ

چمپت رائے نے آہستہ سے کہا۔

"بائیں طرف۔ یہاں سے چوتھا دروازہ"

دروازہ اندر سے بند تھا اور متواتر آدھ گھنٹے کی محنت کے بعد کھل سکا۔

مسعود پلنگ کی طرف بڑھا۔ اسکا باپ سو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ہاتھ پکڑ کر جگایا۔

"میں مسعود ہوں... آپ کا بیٹا۔ آپ کو قید سے چھڑانے آیا ہوں۔ گھبرائیے نہیں فوراً چلیے۔ اور بالکل خاموش رہیے"

مولوی صاحب جلد کپڑے پہن ساتھ ہو لیے۔ لیکن کمرے سے نکل کر کہنے لگے۔

"اس گڑھی میں صرف میں ہی قید نہیں ہوں"

"کیا کوئی اور بھی ہے؟ وقار حسین؟ بینی مادھو؟"

"نہیں میں نے ان لوگوں کو تو دیکھا نہیں"

"پھر کون ہے؟"

"ایک جوان لڑکی"

"آہا، ہونہ ہو نیر دنہ بائی ہے!"

"نام تو میں جانتا نہیں۔ میں نے اکثر اسے باغیچہ میں ٹہلتے دیکھا ہے۔ میرے کمرے کی کھڑکی سے جھک کر دیکھو تو اس کے کمرے کی کھڑکی نظر آتی ہے۔ اس نے کئی با[ر] مجھے اشارے کیے"

"آپ کو اس کے کمرے کا دروازہ معلوم ہے؟"

"ہاں آگے چل کر بائیں طرف گھومو۔ گھومنے سے پہلا دروازہ ہے"

چمپت رائے نے "یہ تیلا کمرہ کہلاتا ہے اس کے دروازہ [illegible]

جھلملیاں ہیں اور جلد کھل جائیں گی۔"

دس منٹ میں ایک جھلملی کٹ گئی اور دروازہ کھول لیا گیا۔ مسعود کے والد نے اندر جا کے لڑکی کو جگایا اور سب حال کہا۔

لڑکی تیار ہو کے باہر آئی۔

مولوی صاحب "مسعود تمہارا خیال صحیح تھا۔ یہ فیروزہ بائی ہیں۔"

چاروں زینہ سے نیچے اترے۔ چمپت رائے نے الٹ پلٹ کر سنتری کو دیکھا اور کہنے لگا۔

"ابھی بے ہوش ہی مگر مر گیا نہیں۔ ضرب تو کاری لگی تھی لیکن میرا چاقو ٹیڑھا ہو گیا مر بھی جائے تو کیا پرواہ، یہ بدمعاش اس قابل ہیں کہ کتے کی موت مارے جائیں"

باہر باغ میں کتے ملے اور اپنے مالک کے ساتھ اچھلتے کودتے دروازہ تک آئے یہاں مسعود کے دونوں دوست میاں شفقت اور حامد اور سب ملکر گاؤں کی طرف چل دیئے۔ رات کے تین بج چکے تھے۔

مسعود اپنے والد کی رہائی سے خوش تھا لیکن اسے ابھی پورا اطمینان نہیں ہوا تھا۔ جب مولوی صاحب اور فیروزہ بائی آرام کے ساتھ کیمپ میں آکے بیٹھ گئے تو گڑھی کے رہنے والوں کے حالات پوچھنے لگا۔ اسے معلوم ہوا کہ بہرام تیسرے چوتھے روز رات کے وقت موٹر کار میں سوار ہو کے گڑھی میں آتا تھا اور صبح ہونے سے پہلے چلا جاتا تھا۔ جب آتا تو مولوی صاحب اور فیروزہ بائی کے کمروں میں جاتا اور دیر تک باتیں کرتا اور نہایت اخلاق سے پیش آتا تھا لیکن آج وہ گڑھی میں نہ تھا

[illegible]

کاج کرتی تھی۔ دو اور مرد ہیں جو رات کے وقت باری باری سے پہرہ دیتے ہیں لیکن وہ کسی سے بات نہیں کرتے اور معمولی نوکر معلوم ہوتے ہیں۔

مسعود "جناب نوکر نہیں بلکہ بہرام کے چیلے ہوں گے"

"عورت سمیت تین بدمعاش یہاں ہیں اور ایسا شکار یہاں ہر روز تھوڑا ہی ملتا ہے میں ابھی انتظام کرتا ہوں"

فوراً بائیسکل پر سوار ہو پاس کے تھانہ کی طرف چلدیا۔ سورج نکلتے نکلتے آٹھ دس پولیس کے جوان اور ایک سب انسپکٹر موقع پر پہنچ گئے۔ دو سپاہی گاڑی اور اسباب پر تعینات کئے گئے۔ دو چور دروازہ پر اور باقی آدمی اور سب انسپکٹر مسعود اور چمپت رائے صدر دروازہ پر گئے لیکن اُسے کھلا پایا اور ایک کاشتکار سے معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر ہوئی ایک موٹر کار گڈھی سے باہر گئی ہے"

تلاش سے کوئی آدمی وہاں نہ ملا۔ بجز چند برتنوں اور کپڑوں کے اور کچھ وہاں نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ عارضی طور پر یہاں ٹھہرے تھے لیکن مسعود اور چمپت رائے کو سخت حیرت تھی کہ زخمی سنتری کہاں غائب ہوگیا۔ نہ زینہ کے نیچے جہاں گُتھم گُتھا ہوئی تھی خون کا نشان پایا۔

غرضکہ ایسی کوئی شہادت نہ تھی کہ حکام کو یقین دلایا جاتا کہ مولوی صاحب اور فیروزہ بائی کو حراست میں رکھنے کا مجرم، بہرام اور اُس کے دوست تھے البتہ اُس کمرے میں جو نیلے کمرے کے متصل تھا پھولوں کے چند گلدستے اور کچھ پڑے ملے۔ پھول مرجھائے ہوئے تھے اور ایک گلدستہ سے بہرام کا ملاقات کا کارڈ بندھا تھا اور ایک گلدستے کے ساتھ علاوہ کارڈ کے ایک خط بھی تھا جو بلا پڑھے پھینک د

گیا تھا مسعود نے خط کھولا تو صفحے کے صفحے رنگے ہوئے تھے۔

ہر صفحہ پر گویا بہرام نے اپنا دل نکال کر رکھدیا تھا اور اپنے عشق و محبت کے اظہار میں اپنی تمام قابلیت صرف کردی تھی۔ لیکن لجاجت اور چاپلوسی کا مضمون تھا کہیں سختی کے برتاؤ کی دھمکی تھی اس تمام لکھے اس سے بہرام کی آتش عشق کی گرمی اور تیزی کا پتہ چلتا تھا۔ جس کے عوض میں فیروزہ کی جانب سے نفرت اور سرد مہری کے سوا اور کچھ حاصل نہ تھا۔ خط کا آخری فقرہ یہ تھا:-

"میری فیروزہ! میں منگل کی رات کو پھر آؤنگا۔ اُس وقت تک تمھیں سوچنے اور غور کرنے کا کافی وقت ہے۔ میرا آخر میں صبر جل چکا ہے اور اب زیادہ انتظار اور لیت و لعل کی گنجائش باقی نہیں۔ اب میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھونگا"

لیکن خوش قسمتی سے اُسی رات کو مسعود کی کوشش سے فیروزہ بائی نے اس قید سے رہائی پائی۔

ناظرین اندازہ کرسکتے ہیں جسوقت اہل دہلی کو یہ معلوم ہوا کہ فیروزہ بائی جسے حاصل کرنے کے لیے بہرام نے ایسی عجیب و غریب تدابیر اختیار کی تھیں اور جسکے عشق و محبت میں بہرام تمام دنیا قربان کرنے پر آمادہ تھا اُس کے چنگل سے آزاد ہوگئی کس قدر حیرت ہوئی ہوگی۔ مسعود کے والد کو بہرام اسی غرض سے اُڑا لے گیا تھا کہ اُس کا سب سے بڑا اور خطرناک دشمن، مسعود اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنے پائے لیکن واہ رے مسعود تم نے اُنھیں بھی آزاد کرلیا اور اب بہرام کا مقابلہ بلا خوف و خطر کرسکو گے۔

اب تو نیلی چھتری کا معمہ بھی حل ہوگیا اور دنیا پر سب کچھ روشن ہوگیا

تمام اخبار بہرام کی شکست اور مسعود کی کامیابی کے حالات سے پُر ہوگئے۔ دہلی کے بعض جدت پسند شعرا نے بہرام اور فیروزہ بائی کے تعلقات پر متعدد غزلیں کہہ ڈالیں اور دہلی کی گلیوں میں ہر کہ و مہ کی زبان پر سوائے اِن مضامین اور غزلوں کے اور کچھ نہ تھا۔ کوئی نالۂ بہرام گاتا پھرتا کوئی جور کے عشق کی صدا لگاتا۔

مسعود نے اپنی تفتیش کے حالات بے کم و کاست انیس میں شائع کرادیے لیکن فیروزہ بائی سے اخبار والوں کا تقاضا تھا کہ بہرام کے کچھ اور حالات بتائیے مگر اُس نے تمکنت آمیز خاموشی اختیار کرلی۔ تاہم بہرام کی بیقراری اور پھول اور گلدستے بھیجنے کا اقرار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اب کیا تھا دہلی کی مخلوق اُس بہرام کو جس کی معمولی چالاکیوں پر صدائے آفرین و تحسین بلند کرتی تھی، نفرت و حقارت سے دیکھنے لگی۔ اور مسعود کی تعریف کے پُل باندھ دیے۔ آخر وہی دہلی کی مخلوق تھی جس نے ایک دن نادر شاہ کی بذلہ سنجیوں اور بھونڈے مذاق اور حاضر جوابی کو آسمان تک سراہا اور دوسرے دن دہلی کے بھانڈ خانہ تک میں نادر کی موت اور شکست کی خبر اُڑنے لگی۔

باب ۱۴

بہرام کی شکست

نیروزہ بائی کی واپسی پر جسے دنیا مردہ تصور کر چکی تھی، مسٹر سہراب جی کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اُس نے اپنے محسن مسعود اور اُس کے والد سے درخواست کی کہ چند روز اُن کے ساتھ بسر کریں اور دو تین دن کے بعد سب لوگ کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ چلے گئے تاکہ دہلی کے واقعات کی یاد دل سے کم ہو جائے مسٹر چمپت رائے بھی مدعو کئے گئے۔

مسعود تو زیادہ دنوں نہ ٹھہر سکا کیونکہ اُسے علی گڑھ جا کر امتحان کے لیے تیاری کرنا تھی۔ امتحان سر پر آگیا تھا اور مسعود پھر معمولی طالبعلموں کی طرح زندگی بسر کرنے لگا۔ لیکن چمپت رائے چند روز کے لیے ٹھہر گیا۔

اب سب کو یقین تھا کہ بہرام اس شکست کے بعد سر نہ اُٹھائیگا۔ اسکی تصدیق اِس واقعہ سے اور بھی ہو گئی کہ ایک دن صبح کو وقار حسین اور بینی مادھو چاندنی چوک کے فوارے کے جو عین کوتوالی کے سامنے ہی بیہوش پڑے ملے ایک ہفتہ تک اُن کے حواس ٹھیک نہ ہوئے۔ بینی مادھو الہ آباد کا مشہور سراغرساں شرم اور غصہ کی وجہ سے بالکل خاموش رہا۔ وقار حسین سے معلوم ہوا کہ دہلی سے سمندر کے کنارے پہونچنے تک وہ بیہوش رہا اور جب ہوش آیا تو بینی مادھو کے ساتھ ایک زیرآب چلنے والی کشتی میں سوار پایا ہفتوں کشتی پانی کے نیچے چلتی رہی اور آخرکار اپنے آپ کو پھر دہلی میں پایا۔

اس سے ظاہر تھا کہ بہرام نے ہاری مان کے اور فیروزہ بائی کی طرف سے سرد مہری اور نفرت کا برتاؤ دیکھ کر قزاقی اور چال بازی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ اُس نے دو بے گناہ آدمیوں کو قید رکھنے میں کوئی فائدہ نہ دیکھا۔

ایک تازہ واقعہ نے اس خیال کو یقین کے درجہ تک پہونچا دیا۔ چپیت رائے کو سہراب جی کے گھر میں رہتے کچھ عرصہ ہوا تھا کہ فیروزہ بائی کے ساتھ اُس کی منگنی ہو جانے کی خبر مشہور ہوئی۔ چپیت رائے نے پہلی ہی نظر میں فیروزہ بائی کو اپنے دل میں جگہ دیدی تھی اور اب ایک ہی گھر میں رہنے سے اس جذبہ کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ فیروزہ بائی بھی گذشتہ واقعات کی وجہ سے بےچین اور شکستہ دل ہو رہی تھی اور اُس نے بھی چپیت رائے کی محبت بھری نظروں کی قدر کی اور اپنی تنہائی اور حفاظت کے خیال سے اس نوجوان کے ساتھ جس کی بدولت اُسے آزادی ملی تھی شادی کرنے کو پسند کیا۔ مسٹر سہراب جی تو پہلے ہی سے بر کی تلاش میں تھے فوراً راضی ہو گئے اور عقد کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

اس تاریخ کا انتظار بڑی بےچینی سے کیا جاتا تھا۔ ہر شخص سوال کرتا تھا۔ کیا بہرام جیسا آدمی اسقدر ذلت گوارا کر سکے گا کہ اپنی دلربا فیروزہ کو کسی دوسرے کے ساتھ عقد کرنے دے؟ کیا وہ تاریخ مقررہ سے پہلے فیروزہ بائی کو پھر اُسی طرح اُڑا لیجائیگا جس طرح ایک بار پہلے لے گیا تھا۔

مسٹر سہراب جی نے مکان کی حفاظت کے لیے پانچ چھ سپاہی رکھ چھوڑے تھے اور شادی سے چند روز پہلے مسعود کو بھی بلا لیا تھا۔ دو ایک بار نور محل کے قریب کچھ لوگ مشتبہ حالت میں گھومتے پھرتے دیکھے بھی گئے اور ایک بہت شرابی

جمپت رائے پر منچہ کا فیر بھی کیا گولی ٹوپی میں لگی اور بال بال بچ گیا۔ لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوا اور عقد کی تاریخ آپہونچی۔ برہمو سماج کے طریقہ پر سادگی کے ساتھ نکاح ہوا اور فیروزہ بائی مسز جمپت رائے بن گئیں۔

شادی کا ہونا تھا کہ مسعود کی کامیابی پر مہر لگ گئی۔ مسٹر سہراب جی نے اس خوشی میں بڑے پیمانے پر دعوت دی اور مسعود کے جتنے دوست اور احباب دہلی میں تھے سب کو مدعو کیا۔ افسران پولیس جنھوں نے تفتیش میں حصہ لیا تھا اور شہر کے دیگر حکام و عمائد بھی بلائے گئے۔ علاوہ اس کے یہ جدت کی گئی کہ مسعود کے تمام ہم جماعتوں کو علی گڈھ سے بلایا گیا اور دہلی کے ہر اسکول سے انٹرنس کلاس کے دو دو طالبعلم مدعو کیے گئے۔

دعوت نہایت پر تکلف تھی تمام میزیں چینی اور سونے چاندی کے ظروف سے برقی روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔

دولہا تو جمپت رائے تھا لیکن تمام مہمانوں کی نظریں مسعود پر پڑتی تھیں۔ لوگوں کو اس کے لڑکپن اور اس کے حیرت انگیز کارناموں پر سخت تعجب تھا۔ مسعود بھی اپنی کامیابی اور حاضرین کی صدائے تحسین و آفرین کی وجہ سے نہایت خوش اور بشاش تھا۔

کھانا ختم ہونے پر تقریریں اور نظمیں شروع ہوئیں لوگوں نے مسعود کی تعریف کے پل باندھ دیے اور اسے دہلی کے تمام سرکاری اور غیر سرکاری سراغرسانوں سے بڑھا دیا۔ مسعود جواب دینے کے لیے کھڑا ہوا۔ لیکن اس کے انکسار اور سادگی نے اسے زیادہ نہ کہنے دیا۔ چند الفاظ میں اپنے مدح گویوں اور قدردانوں کا شکریہ ادا کیا

اور بہرام کی شکست اور اہل ملک کو اسکی دست برد سے امان مل جانے پر اطمینان و مسرت کا اظہار کیا۔ چمپت رائے کو شادی، مبارک باد دی اور اسکی امداد کا اعتراف کیا۔ پھر علی گڈھ کے ہم جماعت طالب علموں کی شرکت پر اظہار مسرت کیا۔ مرحبا اور آفرین کی صدائیں چاروں طرف سے آنے لگیں۔

مسعود ابھی کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ دور کی میز پر چند مہمان ایک اخبار پر گرے پڑتے تھے۔ ایک آدمی دیکھنے نہ پاتا تھا کہ دوسرا ہاتھ سے چھین لیتا تھا آخر اس اخبار میں ایسا کیا مضمون تھا کہ لوگ اسقدر بیتاب تھے ایک طرف سے آوازیں بلند ہوئیں کہ مضمون باواز بلند پڑھا جائے تاکہ سب سن لیں۔

میاں شفقت حسین اپنی جگہ سے اٹھے اور اخبار لاکر مسعود کے حوالہ کیا پھر غل ہوا "پڑھ کر سناؤ! پڑھ کر سناؤ!!"

مسعود کھڑا ہوا اور اس اخبار پر نظر ڈالی جو ابھی شفقت صاحب نے دیا تھا دوسرے کالم میں ایک سرخی پر نشان بنا تھا۔ مسعود نے حاضرین سے خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا اور بلند آواز میں مضمون پڑھنا شروع کیا۔ یہ ایک خط تھا جو پروفیسر سعید معلم تاریخ و فلسفہ سیاست نے اخبار نیس کے اڈیٹر کے نام بھیجا تھا۔ مسعود نے یہ مضمون بے تعلقی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا۔ لیکن جس قدر آگے بڑھتا گیا حیرت واستعجاب میں غرق ہوتا گیا اور آخر میں اس کی آواز سے حسرت و یاس ٹپکنے لگی۔ اس مضمون کا پڑھنا تھا کہ مسعود کی کامیابی کا قلعہ آن واحد میں سمندر کے بلبلے کیطرح ناپید ہو گیا، نیلی چھتری کے متعلق سب خیالات غلط ثابت ہوئے اور اس سے بہرام کی برتری اور تفوق کا سکہ مسعود پر بیٹھ گیا۔ مضمون یہ تھا۔

مسعود و بہرام کا مقابلہ

جناب اڈیٹر صاحب انیس۔ تسلیم۔

آج جبکہ تمام شہر دہلی مسعود کی حیرت انگیز کامیابی اور بہرام کی آخری شکست پر خوشیاں منا رہا ہی، نیلی چھتری کے متعلق تاریخی حالات کا اظہار ناظرین انیس کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ بظاہر اس راز سربستہ کے حل کرنے کا سہرا سیاں مسعود کے سر باندھا گیا ہی لیکن حقیقت حال یہ ہی کہ دہلی کی مخلوق نے اپنی عادت کے موافق جلد بازی اور سادہ لوحی سے کام لیا ہی۔ اور اس عجیب و غریب راز کے تاریخی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا ہی۔

شہنشاہ اکبر کا مشہور و معروف وزیر ابو الفضل اکبری نورتن کا سب سے زیادہ درخشاں ستارہ تھا۔ کون نہیں جانتا کہ خاندان مغلیہ میں علم، فضل اور خدا داد ذہانت کے لحاظ سے کسی شہنشاہ کو ایسا وزیر نصیب نہیں ہوا۔ اصل پوچھو تو اکبر کی شہرت کی بنیاد ابو الفضل کے ہاتھ سے رکھی گئی۔

آئین اکبری لکھکر ابو الفضل نے اکبر کے تدبر اور حسن انتظام کی ایسی لاجواب تصویر کھینچی ہی جو ہمیشہ قائم رہے گی اور اکبر کی بڑائی صفحات تاریخ سے کبھی نہ مٹے گی اس لاجواب کتاب میں ابو الفضل نے روزانہ زندگی کی معمولی باتوں سے لے کے انتظام سلطنت کے اصول، نیز اکبر اور اسکے ہمعصروں کے مذہبی اور اخلاقی خیالات تک کو قلمبند کر دیا ہی۔ اس میں صرف ایک فروگذاشت تھی وہ یہ کہ آئین اکبری میں نیلی چھتری کے راز کا کچھ تذکرہ نہ تھا۔

ایک دن ابوالفضل شہنشاہِ اکبر کے سامنے تنہائی میں حاضر ہوا اور ایک چھوٹی سی کتاب رسالۂ نیلی رواق جیب سے نکال کر پیش کی جس میں نیلی چھتری کے راز کا تاریخی حال مفصل درج تھا۔ بادشاہ نے کتاب لے کر ابوالفضل کو بجائے تحسین و مرحبا کہنے کے عتاب کی نظر سے دیکھا اور دوسرے دن ایک اہم سیاسی مہم کے بہانہ سے دکن روانہ کر دیا۔ تاریخ میں درج ہے کہ موضع انتری حدود گوالیار میں ایک باغی جاگیردار نے ابوالفضل کو قتل کر ڈالا لیکن در اصل یہ معرکہ شاہی اشارہ سے ہوا تھا۔ دوسرے سال اکبر کا انتقال ہو گیا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اصل بات سے واقف تھے اور چپکے چپکے نیلی چھتری کے راز کو ابوالفضل کے قتل کا سبب سمجھتے تھے۔ اس شک کے رفع کرنے کے لیے جہانگیر نے ۱۶۱۸ء میں جبکہ وہ کشمیر سے واپس ہوا تو دریائے جمن کے کنارے ایک بارہ دری میں قیام کیا، جسے نیلی چھتری کے نام سے پکارتے ہیں، اور اپنے قیام کی یادگار میں ذیل کا شعر کھدے کتبہ کی صورت میں مثبت کرایا جو نیلی چھتری کی دیوار کو اب تک زینت دے رہا ہے ؎

عجب پر فیض جائے کامرانی ست
نشیمن گاہ جنت آشیانی ست

دو سال کے بعد پھر جہانگیر نے اس جگہ قیام کیا اور اس یادگار میں ایک اور کتبہ لگایا گیا۔ جہانگیر کی دور اندیشی کی وجہ سے عوام کا خیال نیلی چھتری کی نسبت بدل گیا اور اسے صرف ایک پر فضا سیرگاہ کا نام سمجھنے لگے۔ لیکن جہانگیر کا ایک سے زیادہ مرتبہ نیلی چھتری میں قیام کرنا اور کئی روز تک سیر و شکار کے بہانہ سے آ کے ٹھہرنا اتفاقیہ نہیں سمجھا

لے سر سید احمد خاں بہادر نے اپنی بے مثل کتاب آثار الصنادید میں [illegible] عمارت کا حال درج کیا ہے

معمولی بات نہ تھی۔ اُس وقت کے تاریخی حالات کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب کبھی جہانگیر کو مالی یا ملکی مشکلات کا سامنا ہوتا تھا تو نیلی چھتری میں قیام کرتا تھا اور اس قیام کے چند روز بعد جہانگیر کے تفکرات میں کمی ہو جاتی تھی۔

جلوس سنہ ۱۴ھ کے مطلع پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ جہانگیر نے اس جگہ سے فیض پانے اور کامرانی حاصل کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

خیر یہ تو کل کی بات ہے کسی نے آج تک یہ بھی غور کیا کہ آخر اس دہلی کی سرزمین میں کیا مقناطیسی قوت ہے کہ جو فاتح یا حکمراں آتا ہے دہلی کو اپنا دارالسلطنت بناتا ہے کوروں پانڈوں کی کشمکش مہابھارت کی لڑائی محمود کے حملے قطب صاحب کی لاٹ اور ہمارے زمانے میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے سب دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے تھے نادر شاہ طوفان کی طرح درہ خیبر سے نکلا اور دہلی تک چلا آیا، اُس کے لیے باقی ملک پر قبضہ کر لینا کوئی بات نہ تھی۔ لیکن دہلی نے اُسے اس قدر مالا مال کر دیا کہ تسخیر ملک کے خیال کو ترک کر کے ایران لوٹ گیا۔ محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں ملک کی مالی حالت بہت خراب تھی آخر اس قدر مال و دولت کہاں سے آئی کہ وہ نادر شاہ جیسے شخص کی دہاں دوزی کر سکا۔

دہلی کی قدامت کے ساتھ ساتھ نیلی چھتری کا نام بھی جابجا مستند کتابوں میں برابر پایا جاتا ہے۔ اہل ہنود کی روایت کے بموجب یہ عمارت پانڈوں کی وقت کی ہے اندر پرست مہابھارت کے بموجب جو ہندوؤں کی مستند کتاب ہے راجہ یدھشٹر نے اس گھاٹ کے کسی مقام پر یگیہ جگ کیا تھا۔

تزک جہانگیری کے بموجب ہمایوں بادشاہ نے دریا کی سیر کرنے کو یہ چھتری بنائی تھی

جس کا بعد میں کسی امیر نے عمارت میں اضافہ کرکے چتر گڈھی نام رکھ دیا۔ علاوہ اسکے یونانی اور اسلامی سیاحوں کے روزنامچوں میں نیلی چھتری کا نام جابجا ملتا ہے۔ آخر اس نام میں کیا بات ہے کہ ہر وقت اور ہر زمانہ کے لوگوں میں اسکا چرچا پایا جاتا ہے؟

ایک عمارت کی جگہ دوسری عمارت بنانا کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن مختلف خاندانوں اور مختلف قوموں کے حکمرانوں کا اس نام کو برابر قائم رکھنا معنی سے خالی نہیں۔

دلی کئی مرتبہ تباہ اور برباد ہوئی اور ققنس کی طرح اپنی جلی ہوئی خاک سے پھر نئی آب و تاب کے ساتھ قائم ہوگئی۔ دنیا میں کسی دوسرے شہر کی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اتنی مرتبہ تباہ ہو کر پھر اسی جگہ آباد ہوا ہو۔ مرہٹوں نے بھی جس وقت زور پکڑا دہلی کی طرف رخ کیا۔ انگریزوں نے البتہ اپنی سلطنت کا مرکز کلکتہ کو بنایا لیکن آخر کار وہ بھی باوجود دنیا بھر کی مخالفت اور نکتہ چینیوں کے دہلی آئے اور خود ملک معظم نے ہندوستان آکر دہلی کو دارالسلطنت بنایا اور دہلی کی گئی ہوئی عظمت پھر واپس آگئی۔

دراصل نیلی چھتری اس خزانہ کا نام ہے جو صدیوں سے شاہان دہلی کے قبضہ میں چلا آتا ہے اور جس کا مقام اور کھولنے کا طریقہ سوائے شاہ وقت کے اور کسی کو معلوم نہیں رہتا۔ یہ خزانہ بادشاہ اس وقت کھولتا ہے جب ملک کی ضروریات کسی دوسری طرح رفع نہ ہوسکیں۔ ہر بادشاہ دستور کے موافق اپنے زمانہ حکومت میں اس خزانہ میں اضافہ کرتا رہتا ہے اور جب موت کا وقت قریب آتا ہے تو خزانہ کا مقام اور اس کے کھولنے کا طریقہ چند ہندسوں اور حروف کی شکل میں لکھکر ایک لفافہ میں سربمہر کرتا ہے اور اپنے وارث کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد خاندان مغلیہ کا آخری بادشاہ بہادر شاہ قید ہوا

اور اُسکے ساتھ خاندان تیموری سے شاہی اُٹھ گئی۔ لیکن پُرانی رسم کے بموجب آخر وقت
اس راز کا حال اپنے وارث کے سپرد کرنا لازمی تھا۔

جس وقت بہادر شاہ کو معلوم ہوا کہ دہلی کا تاج و تخت چھوڑ کے اُسے قید فرنگ
میں بقیہ زندگی گذارنا ہے، اُس نے اپنے معتمد خاص سالار بیگ کو چند لمحوں کے لیے
تنہا پایا اور اشارہ سے قریب بُلا کے یہ گفتگو کی۔

”سالار بیگ! تمھارا خاندان ہمیشہ سے شاہان مغلیہ کا معتمد اور وفادار رہا“

”حضور! اس ناچیز کی رگوں میں بھی اُنھیں بزرگوں کا خون ہے“

”کیا تم پر ایک نہایت اہم اور رازداری کے معاملہ میں بھروسہ کر سکتا ہوں“

”حضور! مالک ہیں“

بادشاہ نے جیب سے ایک چھوٹی سی کتاب نکالی اور سالار بیگ کو دینا چاہی
لیکن پھر کچھ سوچ کر کتاب کے آخری سادہ ورق کا ایک ٹکڑا نوچا اور اُس پر اپنے قلم سے
چند ہندسے اور کچھ شکلیں لکھ کر ایک لفافہ میں سر بمُہر کیا اور لفافہ کو اپنے قلمی دیوان
میں چھپا کر سالار بیگ سے کہا "کہ اس دیوان کو جس طرح ہو سکے بڑے شاہزادے
کے پاس لے جاؤ اور کہنا کہ اس میں نیلی چھتری کا راز پوشیدہ ہے“

”کچھ اور ارشاد؟“

”بس اس قدر کافی ہے۔ اچھا خدا حافظ!“

بادشاہ کے ہاتھ میں چھوٹی سی کتاب ابوالفضل کا اصلی رسالہ نیلی چھتری کے
متعلق تھا۔ بادشاہ نے فوراً اس کتاب کو آتشدان میں ڈال کے جلا دیا۔
سالار بیگ نے ارادہ سے اس پیام کے پہنچا دینے کا وعدہ تو کر لیا لیکن

قلعہ سے کوئی چیز لیکر باہر نکلنا ناممکنات سے تھا۔ موقع پاکر سالار بیگ اس دیوان کو باہر لے گیا۔ لیکن وہاں جاکر معلوم ہوا کہ بڑے شاہزادے لڑائی میں مارے گئے۔ چند روز کے بعد سالار بیگ بھی گرفتار ہوگیا۔ مگر واہ رے وفاداری! اپنے آقا کے راز کو کسی پر افشا نہ کیا۔

شہنشاہ جہانگیر نے ۱۶۰۸ء میں اس خیال سے کہ لوگ نیلی چھتری پر غور کرنا چھوڑ دیں اور اُسے راجہ یدھشٹر کے وقت کی معمولی عمارت سمجھیں، اس جگہ قیام کیا تھا۔ اس سے صاف مطلب تھا کہ معمولی عقل اور سمجھ کے لوگ اصل راز کو نہ تاڑ سکیں۔ چنانچہ عوام اس دھوکے میں آگئے اور پھر اُنھوں نے ابوالفضل کی موت کے اصل واقعات اور اسباب پر غور کرنا چھوڑ دیا۔

جو دھوکا لوگوں نے ۱۶۱۸ء میں کھایا بجنسہ وہی کیفیت تین سو برس بعد ہوئی یعنی مسٹر مسعود حسن نے باوجود اپنی ذہانت اور دانائی کے ۱۹۱۶ء میں نیلی چھتری کے متعلق وہی دھوکا کھایا۔ اگر بہرام نے آشوتوش چٹرجی کے نام سے مسٹر چمپت رائے سے مکان کرایہ پر لیکر اپنے قیدیوں کو وہاں رکھا۔ اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ اسے یقین کامل تھا کہ مسعود جیسا ہوشیار لڑکا آج نہیں تو کل نیلی چھتری کی تلاش میں نکلے گا اور ضرور پتہ لگا کر رہے گا اگر قیدی یہاں ملے تو وہ سمجھ لیگا کہ نیلی چھتری کے راز کی صرف اتنی ہی حقیقت ہے اور بس۔ گویا بہرام نے اُسی دھوکے کی ٹٹی سے کام لیا جس سے ایک دفعہ جہانگیر تین سو برس پہلے لے چکا ہے۔

جناب اڈیٹر صاحب! میرا اس طویل خط لکھنے سے صرف یہ [illegible] ہے کہ [illegible] ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ مسعود کی کامیابی جسکا چرچا گلی کوچوں میں ہو رہا ہے اس سے

زیادہ وقعت نہیں رکھتی کہ اس نے بڑا دھوکا کھایا اور اس دھوکے میں آکر بہرام کی تلاش چھوڑ دی۔

واہ رے بہرام! خوب دھوکا دیا۔ حقیقت میں تو اس قابل ہے کہ شاہانِ دہلی کے خزانہ کا مالک بنے۔ اس میں کچھ بھی شک نہیں ہے کہ بہرام نے اپنی خداداد قابلیت اور فراست کی مدد سے شاہانِ مغلیہ کے راز کو دریافت کرلیا اور اس پوشیدہ خزانہ پر قابض ہو گیا ہے، جس کے مقابلہ میں بڑے بڑے ملکوں کی مجموعی دولت بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔"

مسعود کو اپنی شکست کا پورا احساس تھا اور شرم و خجالت کی وجہ سے پانی پانی ہوا جاتا تھا۔

مضمون ختم ہوتے ہی اخبار مسعود کے ہاتھ سے گر پڑا اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانک کے رو[illegible] کرسی پر [illegible] ہر طرف سے لوگ اُٹھے اور مسعود کے گرد حلقہ کرلیا اور انتظار میں تھے کہ مسعود اس خط کے مضمون کی تردید کرے گا یا نیلی چھتری کے متعلق کوئی اور بات کہے گا لوگ بیتاب تھے لیکن مسعود کو کچھ خبر نہ تھی۔ آخرکار جمیت رائے نے اُٹھ کر مسعود کے ہاتھ منہ سے اُٹھائے مسعود زار قطار رو رہا تھا اور ایک لفظ نہ کہہ سکا۔

باب ۱۵

بادشاہ کا دیوان

رات کی گاڑی سے مسعود علی گڈھ جانے والا تھا لیکن اب ارادہ ملتوی کر دیا۔ جب تک بہرام سے جنگ جاری ہے لکھنا پڑھنا کس طرح ہو سکتا تھا کوچہ پنڈت میں اپنے پرانے دوست نورالدین کے یہاں قیام کیا۔ صبح ۶ بجے سو کر اٹھا۔ آئینہ کے سامنے کھڑا ہوا انگڑائیاں لے رہا تھا۔ آنکھوں میں رونے کے آثار اب باقی نہ تھے لیکن چہرہ سے پژمردگی اور تکان ظاہر ہوتا تھا۔ سونے سے پہلے قسم کھا چکا تھا کہ جب تک بہرام پر فتح حاصل نہ ہوگی دنیا کا کوئی کام نہ کرونگا۔

مایوسی اور غصہ کی حالت میں اتنی بڑی قسم تو کھا بیٹھا لیکن اُسکی بساط کیا تھی؟ آخر پھر لڑکا اور ناتجربہ کار۔ بہرام شاطر اور کہنہ مشق۔ مسعود اس کی طاقت کا مقابلہ کس طرح کر سکتا تھا بہرام آدمی نہیں بلکہ دیو اور جن تھا، اُسے شکست دینا چاند کو پکڑنے کی آرزو کرنا تھا۔ آخر اُسپر کس طرح اور کہاں اور کب وار کیا جائے۔ اُسکی ہر بات میں جدت اور قدم قدم پر نئی طاقت اور فراست ظاہر ہوتی تھی

دو چار منٹ نہیں، پورے دو گھنٹہ آئینہ کے سامنے کھڑا غور کرتا ۸ بج گئے لیکن مسعود ابھی کسی فیصلہ پر نہ پہونچا تھا۔ اتنی بات البتہ صاف تھی، جسمیں شک اور شبہہ کی مطلق گنجائش نہ تھی، کہ نیلی چھتری کے متعلق اُس نے بڑا دھوکا کھایا اُسے صاف نظر آتا تھا کہ نیلی چھتری محض ایک عمارت ہی نہیں ہے جسے بہرام نے اپنی عارضی

تفریح گاہ بنا رکھا ہو بلکہ ایک ایسا بیش بہا خزانہ ہو جسے شاہانِ دہلی نے اہم ضرورتوں کے لیے جمع کیا ہو۔ علاوہ اُس نسخے کے جو شہنشاہِ اکبر نے ابوالفضل سے لیا تھا نیلی چھتری کی کتاب کا اصلی مسودہ ابوالفضل کے پاس مرتے وقت ہوگا اور اُسکے قاتلوں نے یا تو ضائع کر دیا یا اُنکے خاندان میں کہیں ہوگا۔ جو نسخہ بہادر شاہ کو ورثہ میں ملا تھا اُسکا وہ صفحہ جس پر نیلی چھتری تلاش کرنے اور اُسکے کھولنے کا طریقہ تحریر تھا، بادشاہ نے اپنے دیوان کی جلد میں چھپا کر سردار بیگ کو دیدیا تھا۔ قلعہ سے باہر جا کر سردار بیگ فرنگیوں کے ہاتھ میں قید ہو گیا۔ سوال یہ ہو کہ بادشاہ کا دیوان کہاں ہو اور اُسمیں وہ کاغذ ابھی تک موجود ہو یا نہیں؟ کیا کاغذ کا وہ پرزہ جو سالک رام نے اِس بیرحمی کے ساتھ مسعود سے چھین لیا تھا اُس راز کی کنجی تو نہ تھی؟۔

حُسنِ اتفاق سے نورالدین کے والد گھر پر موجود تھے۔ یہ دہلی کے بڑے باوضع بزرگ تھے۔ شاعری میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اُنھیں وہ زمانہ یاد تھا، جب قلعۂ دہلی میں مُشاعرہ کی محفلوں میں شریک ہوتے اور نہ صرف بادشاہِ وقت بلکہ شاہ اقلیم سخن یعنی غالب مرحوم کی غزلیں سنا کرتے تھے۔ شاہی دیوان کے قلمی نسخے کے حالات اُن سے بہتر اور کون جانتا ہوگا۔ فوراً آہِ سرد بھر کے بولے۔

”میاں مسعود! بادشاہ کا قلمی نسخہ اُن کے ساتھ دفن ہو گیا“

”لیکن بادشاہ سلامت اُس نسخہ کو سردار بیگ کو دے گئے تھے۔ مرتے وقت اُن کے پاس نہ تھا“

”ارے میاں سمجھتے نہیں۔ بادشاہ گور میں دفن ہوئے۔ اُن کا دیوان کاٹھ کی الماری میں، ہمارے نزدیک تو دفن ہو گیا“

"مہربانی کرکے یہ فرمایئے کہ الماری کہاں ہے؟"

"ہوتی کہاں، یہیں دہلی میں۔ عجائب خانہ جاکر دیکھ لو۔"

دہلی کا عجائب خانہ ۱۰ بجے کھلتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک گاڑی سے مسعود اور نورالدین کود پڑے۔ سیڑھیوں پر پہونچے تو برآمدہ لوگوں سے بھرا پایا۔ جو لوگ رات کی دعوت میں شریک تھے انہیں سے بیسیوں آدمی شاہی دیوان کی تلاش میں عجائب خانہ آئے تھے۔ ممکن ہو کہ بہرام بھی انہیں شامل ہوا۔

سب ایک ساتھ اندر داخل ہوئے، اور محافظ عجائب خانہ سے دریافت کیا کہ بادشاہ ظفر کے دیوان کا قلمی نسخہ کہاں ہے۔ اُسنے انھیں لیجاکر نیشہ کی چھوٹی الماری کے سامنے کھڑا کردیا جسمیں شاہان دہلی کی بہت سی چیزیں بطور یادگار رکھی ہوئی تھیں، منجملہ اُن کے ایک چھوٹی سی کتاب تھی۔ معمولی جلد بالکل سادہ۔ لیکن کتاب کی سادگی میں عجب تاثیر تھی۔ دہلی کے آخری بادشاہ کا رخصتی منظر یاد آگیا بادشاہ کی بےکسی اور بےبسی، اولاد کا غم، خاندان کی بربادی کا خیال کرکے لوگوں کا دل بھر آیا اور ہر شخص اس تبرک کو ہاتھ لگاتے جھجکتا تھا۔ بالآخر کوئی بول اُٹھا۔

"مسعود صاحب یہ آپ کا حق ہے۔ بسم اللہ کہکر کتاب کھولیے۔"

مسعود نے کتاب باہر نکالی اور بےصبری کے ساتھ اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور کہنے لگا "بظاہر اس میں کوئی پوشیدہ شے نظر نہیں آتی۔"

جلد کی شروع کا پٹھا انگلیوں سے دبا دبا کر دیکھا۔ مگر بےسود۔ دوسرا پٹھا اوپر کے سرے کے قریب کسی قدر دبیز معلوم ہوا جا تو سے چپکے ہوئے کاغذ کا کنارہ ہٹایا، چھوٹا سا

کاغذ کا پُرزہ لپٹا ہوا نظر آیا۔ مسعود نے آہستہ سے کاغذ باہر نکالا۔ ہر طرف سے خوشی کا نعرہ بلند ہوا، اور سب لوگ اس پُرزہ کاغذ کو دیکھنے کے لیے جُھک پڑے۔ کاغذ پر سُرخ روشنائی سے ذیل کی عبارت لکھی تھی۔

شہزادۂ جانعالم۔ سپردم بتو مایۂ خویش را

بہادر شاہ

بہرام

لیکن مسعود کی حیرت اور مایوسی کی کوئی حد نہ رہی جب اُس نے اس متبرک تحریر کے نیچے بہرام کے دستخط دیکھے۔ قریب تھا کہ مسعود بیہوش ہو جائے لیکن ایک دوست نے بڑھکر سنبھال لیا۔ حاضرین نے یکبارگی ”بہادر شاہ! ... بہرام“ کہا، تھوڑی دیر کے لیے خاموشی طاری ہو گئی

خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہ کے دستخط پر نظر پڑنا اور اُسی کے ساتھ بہرام جیسے شاطر چیرا اور دنیا پرست کا نام دیکھنا! حسرت ناک منظر تھا۔

”ظالم بہرام یہاں بھی پہنچ گیا۔ غضب“

مسعود ”جی ہاں! سردار بیگ۔ بیچارہ قید ہو گیا۔ شاہزادہ جانعالم دوسری دنیا میں پہونچ گیا! برسوں یہ کتاب حکیموں کے خاندان میں رہی اور آخر کار عجائب خانہ میں پہونچ گئی۔ مگر کوئی اصل راز سے واقف نہ ہوا۔ کاش خاندان تیمور کے کسی رکن کو یہ راز مل جاتا تو اُن کی زندگی اس قدر عسرت اور تنگدستی میں نہ کٹتی۔ مگر قسمت سے کیا چارہ ہے۔ شاہانِ دہلی کا خزانہ بہرام کو ملنے والا تھا۔ بہرام نے اس راز کو معلوم کر لیا

اور اصل چیز لے گیا۔

"آخر کیا لے گیا؟"

"بہرام سب کچھ لے گیا۔ وہ کاغذ جس پر خزانہ معلوم کرنے اور کھولنے کا طریقہ تحریر تھا۔ ہو نہ ہو وہی تھا جو کئی گھنٹے میرے پاس رہا۔ اور اب میں سمجھتا ہوں کہ سالک رام نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کر کے اُسے کیوں چھین لیا تھا۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"ہوتا کیا! تحریر کے اصل ہونے میں ذرا بھی شک نہیں، دستخط بادشاہ کے ہیں اور "سپردم بتو مایۂ خویش را" اس بات کو صاف ظاہر کر رہا ہے کہ جو باتیں اس کے متعلق پروفیسر سعید نے اخبار ٹائمس میں شائع کی ہیں بالکل صحیح ہیں۔ نیلی چھتری کی اہمیت میں شبہہ کی مطلق گنجائش نہیں ہے اور اس لیے یہ امر بھی یقینی ہے کہ میں ایک نہ ایک دن اس عجیب و غریب راز کو معلوم کر لونگا! انشاء اللہ!"

"لیکن معلوم کس طرح کرو گے؟ کاغذ کے ذرا سے پُرزہ پر چند ہندسوں اور شکلوں کے سوا اور کچھ نہیں، اور اصل کتاب جس میں اس کے متعلق تفصیلی حالات درج تھے، خود بادشاہ نے آتشدان میں ڈال کے جلا دی تھی۔"

"یہ صحیح ہے، لیکن کتاب کا اصل نسخہ جو ابوالفضل کے قاتلوں کے قبضہ میں آیا کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔"

"آخر یہ کس طرح معلوم ہوا؟"

"یہ صرف اس وجہ سے کہ اس کے ضائع ہو جانے کے متعلق کہیں ایک حرف بھی درج نہیں ہے۔"

کچھ خاموشی کے بعد مسعود کہنے لگا :-

"ابوالفضل کے قاتلوں میں ایک شخص مان سنگھ بھی تھا جو انتری کے جاگیردار کا عزیز اور شاہی فوج میں ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ ابوالفضل کے قتل کے چند ماہ بعد مان سنگھ دہلی کے متصل موضع مہرولی میں مُردہ پایا گیا اور اُسکی پگڑی میں ایک قیمتی ہیرا برآمد ہوا۔ جس وقت مان سنگھ کے قتل ہو جانے کی خبر بادشاہ کو ملی بنفس نفیس اسی وقت مہرولی گیا اور مان سنگھ کی نعش کو اپنے ساتھ قلعہ میں اُٹھوا لایا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مان سنگھ نے اصل نسخہ کو پڑھا اور اُس کے صحت کی جانچ کرنے کے لیے خزانہ تک پہونچ گیا۔ جہاں سے وہ ایک ہیرا نکال لایا۔ اکبر جیسے بادشاہ کا ایک معمولی افسر کی موت کی خبر پاکر اس قدر مضطرب ہونا! اور خود جاکر نعش کو قلعہ میں اُٹھا لانا اس بات کی دلیل ہے کہ اکبر کو اصل نسخہ کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔"

"لیکن اس بحث سے نتیجہ؟"

"نتیجہ یہ ہے کہ ابوالفضل کا اصل نسخہ جس میں نیلی چھتری کے حالات درج ہیں، کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ ہم سب کی یہ کوشش ہونا چاہیے کہ اُس رسالہ کو ڈھونڈھ نکالیں کسی پُرانے کتب خانہ کی کرم خوردہ الماریوں میں یا کسی کباڑی کی دوکان میں۔ غرضکہ جہاں ہو ڈھونڈھنا چاہیے۔ بلکہ مناسب ہوگا کہ اُس کے متعلق اخبارات میں اشتہار دیا جائے۔"

فوراً اشتہار کا مضمون لکھا گیا اور اخبارات میں بھیج دیا گیا۔ مسعود نے اشتہار کے نتیجہ کا انتظار کیے بغیر جوش کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ اُسی دن موٹر کرایہ کرکے مہرولی پہونچا۔ مان سنگھ کے قتل کو تین سو برس گذر چکے۔ یہ امید رکھنا کہ اتنے دنوں کے

بعد اُس کے مفصل حالات کا پتہ چل سکے گا بے سود تھا۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہی کہ چھوٹے چھوٹے تاریخی واقعات صدیوں تک لوگوں کے ذہن میں رہتے ہیں اور ایک نسل سے دوسری تک سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں۔ مدتوں بعد کوئی مؤرخ یا آثارِ قدیمہ کا ماہر آتا ہی اور دہقانیوں سے بات چیت کرتے وقت کسی بڑے واقعہ کی کڑی ملا لیتا ہی۔ مسعود بھی اس خیال سے مہرولی پہونچا ہی تو چھوٹی سی جگہ لیکن عابدوں اور زاہدوں کے مقبروں کی وجہ سے بہت متبرک سمجھی جاتی ہی اور یہاں شرفا کے کئی خاندان صدیوں سے آباد ہیں۔ مسعود نے مختلف لوگوں سے جن میں ایک قاضی صاحب بھی تھے اپنی مطلب کی بات پوچھی لیکن تشفی نہ ہوئی۔ دہلی واپس آکر شاہی ملازمین کے ورثا کو تلاش کر کے مان سنگھ کا حال دریافت کیا مگر بے سود۔

پھر ایک اور خیال آیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مان سنگھ کے رشتہ داروں کا پتہ چل سکے جس وقت مان سنگھ قتل ہوا رسالہ نیلی رواق اُس کے قبضہ میں نہ تھا۔ ممکن ہے کہ اُس کے ورثا کے پاس ہو۔ کتب خانہ جا کر اکبر کے زمانہ کے جاگیرداروں اور فوجی افسروں کی فہرست دیکھنا شروع کی۔ بڑی محنت سے اُس نے ایک یادداشت تیار کی اور اپنے معلومات ایک مختصر مضمون کی صورت میں اخبارات میں شائع کر کے درخواست کی کہ مان سنگھ کے ورثا کا پتہ کسی کو معلوم ہو تو اطلاع دیجائے۔

چند روز بعد پروفیسر سعید کا جنھوں نے پہلی مرتبہ مضمون لکھ کر مسعود کی غلطی کو بتایا تھا، ایک خط مسعود کے نام پہونچا۔ مضمون یہ تھا:۔

جنابِ من تسلیم۔

مولانا آزاد مرحوم کے دربارِ اکبری کا اصل قلمی نسخہ میری نظر سے گذرا۔ اس میں

ذیل کی عبارت حاشیہ پر درج ہے مگر کسی مطبوعہ نسخہ میں پتہ نہیں۔

فیضی نے اپنے ایک دوست سے بیان کیا کہ جس وقت مان سنگھ کے قتل اور ہیرے کے برآمد ہونے کی خبر بادشاہ کو پہونچی میں دربار میں موجود تھا۔ بادشاہ بے انتہا متوحش ہوئے اور بار بار کہتے تھے۔

"افسوس۔ افسوس غضب ہو گیا!"

چند ماہ کے بعد مان سنگھ کی بہن جس کی شادی کنور دلیر سنگھ کے ساتھ ہوئی تھی دہلی سے جلاوطن کی گئی اور اپنے شوہر کنور دلیر سنگھ کی جاگیر واقع راجپوتانہ میں بھیجدی گئی۔ یہ ایک عجیب واقعہ ہے اور اس میں کوئی راز پوشیدہ ہے۔

فیضی ابوالفضل کا بھائی تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اپنے بھائی سے اُسے نیلی چھتری کے حالات معلوم ہو چکے تھے۔ اُس کے حوالہ سے اس روایت کا قلمبند ہونا صحت کی کافی دلیل ہے۔ بادشاہ کا ناراض ہو کر مان سنگھ کے اعزا کو دہلی سے نکال دینا کچھ معنی ضرور رکھتا ہے۔ میں نے خود تاریخ راجپوتانہ تحریر کرنے کے زمانہ میں وہاں کے جاگیرداروں کے حالات کی بخوبی تفتیش کی تھی۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ کنور دلیر سنگھ شاہی عتاب کی وجہ سے عرصہ تک اپنی جاگیر پر قابض نہیں رہے اور ان کے خاندان کا ایک حصہ کچھ عرصہ کے بعد دکن چلا گیا۔ جب سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوا اور انگریزی قوت کا تسلط ہونے لگا دکن کے چند راجپوت انگریزی فوج کے ساتھ شمالی ہندوستان آئے۔ کنور کرم سنگھ ایک عیسائی مہ جبین کے عشق میں ایسا متوالا ہوا کہ اپنے آباواجداد کے مذہب کو خیرباد کہا اور خود عیسائی بن کر اس مہوش کے ساتھ شادی کر لی۔ سردھنہ میں بودوباش اختیار کی اور جنگی خدمات کی عوض ایک جاگیر بھی

حاصل کی۔ اُس خاندان کا ایک زمیندار کنور برجیس سنگھ نامی اب بھی سردھنہ میں رہتا ہے۔ میں نے احتیاطاً اُس سے دریافت کیا ہے کہ اُس کی خاندانی کتابوں اور کاغذوں میں کوئی کتاب "رسالۂ نیلی رواق" ملے تو مجھے اطلاع دے۔ میں ابھی تک جواب کا منتظر ہوں۔

میں نہایت خوش ہوں گا اگر آپ کسی وقت میرے پاس آکر اس کے متعلق بالمشافہ گفتگو کریں گے۔ میں نے ابھی تک اِن واقعات کی اطلاع اخبارات میں نہیں بھیجی ہے۔ چونکہ آپ منزل مقصود کے اس قدر قریب پہونچ گئے ہیں، ہر قسم کی احتیاط لازم ہے۔ اخباروں میں بات گئی اور تیر از کماں رفتہ ہوئی۔

خاکسار

سعید

شام کے وقت مسعود پروفیسر سعید سے ملنے موری دروازہ گیا لیکن مکان پر پہونچکر معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب کسی ضروری کام سے باہر گئے ہیں اور مسعود کے لیے ایک سر بمہر خط چھوڑ گئے ہیں۔ مسعود نے جلدی سے لفافہ کھولا اور خط پڑھا۔

"مجھے ابھی ایک تار ملا جو بہت امید افزا ہے۔ میں شام کی گاڑی سے سردھنہ جاتا ہوں۔ رات کو اسٹیشن پر قیام کرونگا۔ آپ بھی رات کی گاڑی سے آجائیے میں کنور برجیس سنگھ کی گڈھی پر جو اسٹیشن سے دو میل کے فاصلہ پر ہے ملونگا۔"

باب ۱۶

پروفیسر سعید اور مسعود کی ملاقات

خط پڑھ کر مسعود بہت مسرور ہوا۔ کامیابی کا دروازہ سامنے کھلا نظر آنے لگا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں پروفیسر سعید جو اس میدان کے مرد نہیں اس بنے بنائے کھیل کو اپنی جلد بازی سے بگاڑ نہ دیں۔ رات کی گاڑی سے سر دھنہ روانہ ہو گیا۔

اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ پروفیسر سعید کچھ دیر ہوئی گڑھی کی طرف گئے ہیں مسعود بھی ضروریات سے فارغ ہو کر گڑھی کی طرف چلدیا۔ باغوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی سر دھنہ کی پرانی گڑھی کے دھس نظر آنے لگے۔ چہار دیواری کے اوپر گرجا گھر کی چوٹی اور گڑھی کے کنگورے گویا مسعود کو کامیابی اور کامرانی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ یہ گڑھی پرانی طرز پر بنی تھی۔ چاروں طرف دھس، اسکے بعد گہری خندق اور چہار دیواری۔ اندر کے قطعہ میں ایک طرف پرانے مکانات تھے لیکن باغ میں نئے وضع کی دو منزلی کوٹھی تعمیر کی گئی تھی جس میں کنور صاحب اور ان کی بیوہ بیٹی رہتی تھی گڑھی کے سامنے پہونچا تو مسعود کا دل بانسوں اچھلنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کامیابی کے آخری زینہ پر قدم رکھنے والا ہے اور اس گڑھی میں اس راز کی کنجی ہے جس کی تلاش میں آنی مدت سے حیران و سرگرداں ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ فوراً یہ خیال آیا کہ یہ بھی بہرام کی کوئی چال بازی نہ ہو۔

ممکن ہے کہ بڈھا پروفیسر بہرام کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کام کرتا ہو۔ دل کی اس کیفیت پر یکایک ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

"وہم کی کوئی حد ہوتی ہے۔ آخر بہرام آدمی ہے، جن اور فرشتہ نہیں ہے جس کے مقابلہ میں انسان معذور اور مجبور رہو۔ بہرام بھی اور آدمیوں کی طرح غلطی کر سکتا ہے، جیسا ایک مرتبہ پہلے اُس کی غفلت سے اُس "اسم اعظم" کا اصل پرچہ میرے ہاتھ لگ گیا تھا، اس قسم کی غلطی پھر بھی ہو سکتی ہے۔ پہلی بار بہرام سے یہ چوک نہ ہوتی تو میں کامیابی کے اس درجہ تک کب پہونچ سکتا تھا۔ یہ سب وہم و خیال ہے۔ چلو اندر چلیں۔" آگے بڑھا اور پہرہ دار کو اپنا کارڈ دیا۔

مُلازم "ذرا دیر انتظار کیجیے۔ کنور صاحب کپڑے پہن لیں تو آپ کی اطلاع کروں۔"

مسعود "کیا ابھی ایک اور صاحب یہاں آئے ہیں۔"

مُلازم "جی ہاں۔ کوئی دس منٹ ہوئے گول کمرے میں بیٹھے ہیں آپ بھی تشریف لائیے۔"

کنور صاحب اگرچہ عزلت نشین تھے لیکن اُن کا مکان اور ساز و سامان نہایت اعلیٰ پیمانے پر زمانۂ حال کے موافق تھا۔ مکان کے ہر حصہ میں برقی روشنی اور پنکھے کوٹھی کے سامنے وسیع لان اور نہایت خوبصورت باغیچہ تھا۔

مسعود ملاقات کے کمرے میں داخل ہوا۔ پروفیسر سعید نے آگے بڑھ کے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور مزاج پرسی کی۔ اسی کے ساتھ مسعود کی زیرکی اور ذہانت کی بے انتہا تعریف کی۔ مسعود نے بھی پروفیسر کی قیمتی امداد کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد دونوں آدمی اصل کتاب کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ پروفیسر سعید، کنور صاحب کے جو حالات یہاں آکر معلوم کیے تھے بیان کیے۔ کنور صاحب کی عمر ساٹھ سے کم نہ تھی۔ جوانی میں اُنھوں نے یورپ اور امریکہ کے ممالک کی سیر کی تھی اور علم طبیعات کے تجربات میں برسوں صرف کیے اور صحت بھی خراب کر لی اور بالکل گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ اُنکے ساتھ کچھ عرصہ سے اِن کی بیوہ بیٹی مسز جے رام سنگھ بھی رہتی ہیں۔ پانچ چھ مہینے ہوئے اُن کا شوہر جو پنجاب کا نامی ڈاکٹر تھا اور بڑا لڑکا جو نہایت ہوشیار تھا موٹر کار میں سوار جا رہے تھے کہ موٹر ایک گاڑی سے ٹکرا گئی اور دونوں مر گئے۔ اب صرف چار برس کا ایک لڑکا باقی ہے۔ جو مسز جے رام کے ساتھ رہتا ہے۔ اس خاندان کا یہی وارث باقی ہے۔

"کنور صاحب آپ دونوں صاحبوں کو سلام دیتے ہیں۔ اوپر تشریف لے چلیے۔"

ملازم راستہ بتانے کے لیے آگے ہولیا، زینہ پر چڑھ کے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے جس کا سامان سادہ لیکن میزوں پر ہر طرف علم کیمیا کے تجربات کرنے کے آلات پڑے ہوئے تھے۔

کنور صاحب نے نہایت خلوص اور خندہ پیشانی سے اُن کا استقبال کیا۔

"پروفیسر سعید آپ ہی ہیں۔ میں نے آپ کے مضامین تاریخ و فلسفہ سیاست پر اکثر پڑھے ہیں اور آپ سے ملنے کا مجھے اشتیاق تھا۔ کیا لطف ہوتا کہ آپ جیسا ذہین عالم بجائے تاریخ اور سیاست کے خشک مضمون کے سائنس خصوصاً علم کیمیا کی طرف متوجہ ہوتا۔ تاریخ ایک خشک اور بے ثمر مضمون ہے۔ برخلاف اس کے سائنس قدرت کے بیش بہا مناظر ہمارے لیے کھولتا ہے۔ سچ پوچھیے تو سائنس کے تجربات کرنا اور قدرت کے عجائبات کو اہل دنیا کے لیے مفید اور کارآمد بنانا بہترین عبادت ریاضت ہے۔ افسوس ہندوستان ترقی

کی وجہ سے میرے تمام حوصلے اور ارادے پست ہو گئے۔"

پروفیسر سعید "لیکن جناب اس وقت ہم آپ کی خدمت میں اَور غرض سے حاضر ہوئے ہیں۔ سائنس کی نسبت جو کچھ آپ فرماتے ہیں بالکل بجا اور درست لیکن یہ تو فرمائیے کہ جس کتاب کی نسبت میں نے لکھا تھا ملی یا نہیں؟"

"وہی کتاب نا! جس میں نیلی چھتری کی بابت کچھ لکھا ہے جو میرے بزرگوں کے کتب خانہ میں تھی۔ وہ لوگ دوسری دُنیا میں رہتے تھے۔ کیا کیا فضول قصہ کہانی کی کتابوں سے گھر بھر لیتے تھے۔"

پروفیسر سعید کنور صاحب کی منطق پر مسکرایا اور کچھ دور ہٹ کر کمرے کی کھڑکی کے پاس جا کر باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ مسعود بے تاب ہو رہا تھا۔ آخر کار نہ رہا گیا۔

مسعود "یہ سب کچھ درست ہے لیکن جناب یہ تو بتائیے کہ آپ کی نظر سے وہ کتاب گذری ہے یا نہیں۔"

پروفیسر سعید کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا گویا کہ اس معاملہ سے اُسے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔

"جی ہاں، میں نے تو کتاب نہیں دیکھی لیکن میری لڑکی مسز جے رام نے شاید اُس کتاب کو پُرانی کتابوں کے ڈھیر میں کہیں پڑا ہوا دیکھا ہے۔ میں ایسی فضول کتابوں میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ ریاست کا کاروبار کرتا ہوں اب وقت ملتا ہے علم کیمیا کے تجربات میں صرف کرتا ہوں۔ لیکن افسوس اب میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ اور ایسے قصوں سے جیسا کہ پروفیسر صاحب نے لکھ کر بھیجا تھا مجھے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔

مسعود۔ لیکن کنور صاحب یہ شاد ہو کہ وہ کتاب ہے کہاں؟"

"میری لڑکی کل دن بھر ڈھونڈھتی رہی۔"

"ملی یا نہیں؟"

"جی ہاں مل گئی، جب آپ یہاں آئے . . . ."

مسعود (خوشی کے لہجہ میں) "ذرا عنایت کیجئے۔ ہے کہاں؟"

"ہوتی کہاں؟ وہ دیکھو اُس میز پر رکھی ہے۔"

مسعود نے ایک زقند لگائی اور کمرے کے گوشہ میں جہاں ایک چھوٹی میز پر کتاب رکھی تھی پہونچا اور اس مجلد کتاب پر زور سے ہاتھ مارا۔ گویا اُسے اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔

پروفیسر سعید "کیا وہی کتاب ہے؟"

مسعود "اہاہا! ۔ اب کیا ہے! فتح! کامیابی!!"

"لیکن یہ تو دیکھو وہی کتاب ہے یا دوسری"

"دوسری کیوں ہوتی لو دیکھو۔ جلد پر سُنہرے حروف میں لکھا ہے۔ رسالۂ نیلی رواق"

"بے شک ابوالفضل کا اصل مسودہ ہے! مسٹر مسعود مبارک ہو!"

پروفیسر سعید نے شروع سے پڑھنا شروع کیا، شروع میں تاریخی حالات تھے۔

مسعود "اس قصّہ کو چھوڑیے آگے بڑھیے"

"لیکن پہلے یہ تو سمجھ لو کہ مان سنگھ کے اعزا دہلی سے جلا وطن کیوں کیے گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ لوگ اس راز کو بادشاہ کے دشمنوں کے ہاتھ بیچنے والے تھے۔ یہ سب باتیں تاریخی لحاظ سے اس قدر دلچسپ ہیں کہ ایک ایک لفظ پر غور کرنا چاہیے

"یہ سب کچھ بعد میں ہوتا رہیگا" مسعود کی بے صبری کا اندازہ نہ تھا۔ پروفیسر سعید کے ہاتھ سے کتاب چھین کر خود جلد جلد ورق لوٹنے لگا۔

یکایک مسعود رُک گیا۔ ایک صفحہ پر بالکل وہی ہندسے اور شکلیں درج تھیں جو اُس پرزہ پر تھیں جسے سالک رام نے مسعود سے چھین لیا تھا۔ مسعود نے خوب غور سے دیکھا بالکل مطابقت ہوتی تھی!

۷	۶	۲۰۰	۱۰	۸۰
	۴۰	۳۰	۱۰	۲
	۴	۱	۲	۱
۵	۱	۳	۰	۰

۶۱۸ + ۱۰۰

⊙ ۳ ۵ ۲ ⊙ ۵ ۹ ⊞ ۳۳ ▭ ۲ ۷ ۸ [illegible] ۵ [illegible]

اس کے بعد ذیل کی عبارت دیکھی۔

"ہندو راجاؤں کے زمانہ میں سنسکرت کے ایک اشلوک میں وہ سب مطلب درج تھا جو اس راز کے معلوم کرنے کی کنجی ہے۔ لیکن ایک زمانہ میں یہ اشلوک اس قدر زبان زد عام ہوا کہ راز کے فاش ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ لیکن مہاراجہ پرتھی راج کے زمانہ میں اس اشلوک کا پڑھنا ممنوع قرار دیا گیا۔

مسلمانوں کا زمانہ آیا تو فارسی کا رواج ہوا اور جو مقام اس راز کو پوشیدہ رکھتا ہے وہاں انقلاب زمانہ سے نئی آبادیاں قائم ہوگئیں۔ شہنشاہ بابر نے جب اس طلسم اعظم پر قبضہ کرلیا تو اپنے جانشینوں کی آسانی کے لیے نئے حالات بموجب

اوپر کی چار سطریں مرتب کیں تاکہ اس خزانہ کا راستہ معلوم کرنے میں آسانی ہو۔

آخری سطر میں چند اشارے درج ہیں۔ اِن اشاروں اور ہندسوں کی مدد سے ہم منزلِ مقصود تک پہونچ جاتے ہیں۔ آخری سطر کے ہندسوں کو حرفِ ابجد کے قائم مقام نہ سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اِن کے ذریعے سے ہمیں ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہونچنے کے لیے فاصلہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس حصۂ زمین میں پہونچ جائیں جو نیلی چھتری کے قریب واقع ہے۔ رہا یہ امر کہ نیلی چھتری کہاں ہے شروع کی چار سطروں سے معلوم ہو سکتا ہے۔ سطر اول کی عبارت ۔

بادشاہ عالم پناہ کے نزدیک کوئی جرم اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا ۔

مسعود۔ (رک کر) "ہائیں یہ کیا معمہ ہے! یہاں عبارت یکایک بے ربط ہو جاتی ہے"

پروفیسر "میں بھی حیران ہوں، (سطر اول کی عبارت) تک تو مضمون کا سلسلہ ٹھیک ہے لیکن بادشاہ عالم پناہ سے یہاں کیا مطلب ہو سکتا ہے"

مسعود۔ (مایوسی کے لہجہ میں) "افسوس غضب ہو گیا"

"کیوں خیر تو ہے؟"

"یہ دیکھیے یہاں سے دو ورق غائب ہیں"

مسعود غصّہ اور مایوسی سے کانپنے لگا۔ پروفیسر سعید نے جھک کر دیکھا۔

"سچ کہتے ہو۔ ورقوں کے باقی حصے صاف ظاہر کرتے ہیں کہ کسی نے ورق

پھاڑ لیے ہیں۔ اور نشان تازہ معلوم ہوتے ہیں۔"

مسعود: "آہ! معلوم نہیں یہ کس کا فعل ہے۔ ممکن ہے کسی ملازم نے ردی سمجھ کر پھاڑ لیے ہوں۔ لیکن ممکن ہے کہ بہرام کے کسی چیلے کا کام ہو۔

پروفیسر "ممکن ہے، لیکن ورق پھٹے ہوئے دو چار مہینہ سے زیادہ عرصہ گذرا۔"

"معلوم ہوتا ہے کوئی شخص اس کی تلاش میں ہم سے پہلے آچکا ہے۔"

پھر کنور صاحب سے مخاطب ہو کر مسعود نے پوچھا؟

"کنور صاحب، یہ کس کا فعل ہو سکتا ہے۔ آپ کسی پر شک کرتے ہیں؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید مسز جے رام کو معلوم ہوگا۔"

"جی ہاں براہ مہربانی انھیں بلوائیے۔"

کنور صاحب نے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور تھوڑی دیر میں مسز جے رام کمرے میں داخل ہوئیں۔ فوراً مسعود نے پوچھا؟

"مسز جے رام! کیا آپ نے یہ کتاب تلاش کی تھی؟"

"جی ہاں! کتابوں کے ایک بنڈل میں بندھی ملی تھی۔"

"تو آپ نے اُسے پڑھا بھی ہوگا؟"

"بیشک۔ کل شب کو پڑھا تھا۔"

"جب آپ نے اسے پڑھا تھا تو دیکھیے۔ یہاں تک دو ورق ان ہندسوں کے بعد کے اس میں کٹے یا پھٹے ہوئے تھے۔"

مسز جیرام (تعجب سے) "جی نہیں! کتاب مکمل تھی کوئی ورق کم نہ تھا

"لیکن کسی نے ورق ضرور پھاڑے ہیں۔ یہ دیکھیے تازہ نشان"

"بڑی حیرت کی بات ہی۔ رات بھر کتاب میرے کمرے سے باہر نہیں گئی۔"

"اور آج صبح کو؟"

"ابھی تھوڑی دیر ہوئی پروفیسر سعید کی آمد کی اطلاع ہونے پر میں خود اس کتاب کو لا کے کنور صاحب کی میز پر رکھ گئی تھی۔"

"پھر ورقے کیا ہوئے"

"مَیں نہیں کہہ سکتی کہ کیا ماجرا ہی۔ ہاں۔ لالجی اس سے کھیل رہا تھا۔ ممکن ہی اُس سے پھٹ گئے ہوں۔"

دوڑ کر بچے کے کمرے میں گئی مگر بچہ وہاں نہ تھا۔ پھر سب ایک ساتھ نیچے اُترے اور لالجی کو تلاش کرنے لگے۔ لالجی ایک درخت کے نیچے کھیل رہا تھا۔ بار بار پوچھا مگر بچہ بالکل ناسمجھ تھا۔ اتنے آدمیوں کے یکبارگی آجانے سے سہم گیا۔ نوکروں سے دریافت کیا مگر اُنھوں نے بھی کتاب دیکھنے سے لاعلمی بیان کی۔ عجب پریشانی تھی۔ نوکر ایک دوسرے کا مُنھ تکتے تھے اور اس گھبراہٹ کا مطلب نہ سمجھتے تھے۔ مسعود کی پریشانی کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اصل راز اُس کے ہاتھ میں آکے غائب ہوا جاتا ہی۔

مسعود نے اپنے آپ کو اس خواب خرگوش سے ہوشیار کیا اور کنور صاحب اور مسز جیرام سے کہا کہ چلیے اندر چل کے باتیں کریں۔ پروفیسر سعید بھی پیچھے پیچھے گیا سب لوگ گول کمرے میں جمع ہوئے۔

"مسز جیرام۔ آپ دیکھتی ہیں کہ کتاب کے ورقے ضائع ہوگئے۔ خیر کچھ مضائقہ

نہیں! لیکن آپ نے اسے کل رات پڑھا ہے۔ اس کا مضمون آپ کو یاد ہوگا؟

"جی ہاں"

"کیا آپ مہربانی کرکے مجھے بتا سکتی ہیں کہ اس سطر کے بعد کیا مضمون تھا"

"بے شک میں نے کتاب کو غور سے پڑھا ہے اور خصوصاً وہ ورقے جو غائب ہوگئے بیحد دلچسپ تھے اور تمام کتاب کی جان تھی"

"مسز جیرام! مہربانی کرکے جلد بتایئے کہ کیا مضمون تھا۔ آپ کے بیان پر سب کچھ منحصر ہے۔ میری کامیابی اور شہرت سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ دیر نہ کیجئے۔ نیلی چھتری کا حال بیان کیجئے"

"مسٹر مسعود۔ لیجئے بتائے دیتی ہوں۔ بالکل معمولی بات ہے۔ سنئے . . ."

اتنا کہنے پائی تھی کہ ایک ملازم نے مسز جیرام کو ایک لفافہ دیا جس پر ضروری لکھا ہوا تھا۔

مسز جیرام "ڈاک کبھی کی آچکی یہ لفافہ کون لایا ہے؟"

ملازم "ابھی ایک لڑکے نے لاکر دیا ہے"

مسز جیرام نے لفافہ کھول کے پڑھنا شروع کیا۔

دم بھر میں مسز جیرام کی عجیب حالت ہوگئی۔ رنگ زرد پڑ گیا اور خوف اور انتشار سے بدحواس ہوئی جاتی تھی۔ خط ہاتھ سے نیچے گر پڑا۔ مسعود نے لپک کر اُٹھایا اور پڑھا

"خبردار! ایک لفظ مُنھ سے نہ نکلے . . . تم بولیں تو تمھارا لالجی پھر کبھی ایک لفظ نہ بولیگا اور کبھی نہ جاگیگا"

"ہائے غضب۔ میرا لالجی!"

مسعود نے مسز جیرام کو اطمینان دلایا "آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ سب مذاق ہے

کس کی مجال ہو کہ آپ کے بچے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ سوال یہ ہے کہ یہ حرکت کس نے کی ہو؟"

پروفیسر سعید "کہیں بہرام کا تو یہ کام نہیں ہو؟"

مسعود نے فوراً پروفیسر کو اشارہ کیا کہ چپ رہیئے۔ مسعود خوب جانتا تھا کہ دشمن غافل نہیں ہو اور سوائے بہرام کے یہ کام کس کا ہو سکتا ہے۔ لیکن بہرام کا نام سُنکر مسز جے رام کی حالت اور بھی ردی ہو جائے گی۔

مسز جے رام! خدا کے لئے دیر نہ کیجئے جو کچھ آپ کو معلوم ہو کہہ ڈالیے۔ آپ کے بچہ کی حفاظت کا مین ذمہ لیتا ہوں"

مسز جے رام کو قدرے اطمینان ہوا۔ چاہتی تھی کہ کچھ کہے، چند جملے آہستہ آہستہ زبان سے بھی نکلے لیکن اتنے مین بچے کی انا عجب بدحواسی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوئی۔

"ہائے لالجی! سرکار!"

مسز جے رام نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"انا کچھ شرن ہو گئی ہے رکھتی کیوں نہیں کیا ہوا۔ خیر تو ہو؟"

"آپ خود چل کے دیکھئے"

اس کا سننا تھا کہ مسز جے رام باہر دوڑی۔ درخت کے نیچے ایک بنچ پر لال جی خاموش پڑا تھا۔

"انا کیا بات ہو۔ ابھی تو لال جی اچھا خاصہ تھا۔ یہ ناوقت سو کیسے گیا؟"

"کیا بتاؤں۔ لال جی دیکھتے دیکھتے سو گیا۔ میں نے چاہا بھی کہ اندر کمرے میں لے جاؤں

لیکن یکبارگی سوگیا اور ہاتھ پاؤں سرد ہونے لگے"

"سچ تو ہی! ہاتھ ہیں یا برف کی ڈلیاں۔ اے خدا مجھ دکھیاری بیوہ کی زندگی کا سہارا یہی ہی۔ رحم کر"

مسعود نے اپنی جیب میں آہستہ سے ہاتھ ڈالا، چھوٹے سے پستول کا دستہ مضبوط تھاما اور داہنے انگوٹھے سے گھوڑا چڑھایا اور یکایک جیب سے ہاتھ نکال کے بڈھے پروفیسر کی طرف ذرا دان سے فیر کیا! لیکن پروفیسر مسعود کی نقل وحرکت سے غافل نہ تھا، وار خالی گیا۔ مگر مسعود پروفیسر کی طرف لپکا اور گتھم گتھا ہوگیا اور نوکروں سے کہا۔

"دوڑو بہرام یہی ہے"

بہرام کا نام سُننا تھا کہ نوکر سہم گئے اور کسی کو اسکی طرف بڑھنے کی جرات نہوئی مسعود کی جھپٹ ایسی تیز تھی کہ بہرام نیچے گر گیا لیکن لمحہ بھر میں کھڑا ہوگیا اور کچھ ایسا وار کیا کہ مسعود بیہوش، چاروں خانہ چت، زمین پر آرہا۔ پھر مسعود کا پستول ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔

"شاباش! واہ میاں مسعود حملہ تو تمھارا غضب کا تھا، اب تھوڑی دیر یوں ہی پڑے رہو۔ دو چار منٹ میں تمھاری کنپٹی کی نس ٹھیک ہو جائے گی اور تمھیں ہوش آجائے گا۔ مگر باوجود اتنی ذہانت کے تم نے مجھے بڑی دیر میں پہچانا (داڑھی پر ہاتھ پھیر کر) کیا واقعی میں نے بڈھے پروفیسر کا بھیس اسقدر عمدہ بدلا ہی؟"

پستول جیب میں رکھا اور فوراً تن کر کھڑا ہوگیا اور ہیبت زدہ نوکروں کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا۔

"مسعود تم نے بڑی غلطی کی۔ اب ایسا موقع پھر کبھی نصیب نہ ہوگا اگر تم اِن نوکروں کو میرا نام نہ بتا دیتے تو فوراً لپٹ جاتے اور مجھے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا تم سمیت چار مسٹنڈوں سے اکیلا کس طرح مقابلہ کرتا۔"

پھر آگے بڑھا اور جیب سے ایک اشرفی نکال کے اُنکے سامنے پھینکدی۔

"ڈرو نہیں۔ اس کی مٹھائی کھانا۔ لیکن بڈھو اس میں تمھارا حصہ نہیں ہے۔ تم بڑے نمک حرام نوکر ہو۔ لاؤ میرا سو روپیہ کا نوٹ حوالہ کرو جو میں نے ابھی دیا تھا! اور جس کے لالچ میں تم میرا خط مسٹر جے رام کے پاس لے گئے تھے۔ چلو بڑھو!"

نوکر سے نوٹ لے کے پُرزہ پُرزہ کر کے پھونک سے اُڑا دیا۔ "یہ رشوت کا مال ہے میرا ہاتھ اس کے چھونے سے جلا جاتا ہے۔"

پھر مسٹر جے رام کی طرف متوجہ ہوا اور نہایت نرمی اور لجاجت سے بولا۔

"رانی صاحب! مَیں بہت نادم ہوں اور آپ سے معافی کا خواستگار ہوں ضروریات زندگی، خصوصاً مجھ بدبخت کی زندگی، کبھی کبھی سختی اور بے رحمی پر مجبور کرتی ہیں اور ایسی حرکتوں پر سب سے زیادہ مجھے ندامت ہوتی ہے۔ آپ مطلق تردد نہ کریں ابھی درست ہوئے جب ہم سب لوگ بچے سے کتاب کی بابت پوچھ رہے تھے۔ میں نے اُس کے ماتھے پر کچھ چھووا تھا جس کے اثر سے یہ حالت ہوگئی۔ ایک گھنٹہ میں [illegible] کا اثر [illegible] ہو گا اور لال [illegible] پہلے کودنے لگے گا۔ میں آپ سے پھر معافی چاہتا ہوں، آپ کا خاموش رکھنا لازمی تھا۔ اس لیے یہ قصور ہوا۔ معاف کیجیے! بالکل مجبوری تھی۔"

مسٹر جے رام کو جھک کر سلام کیا۔ میز سے اپنی ٹوپی اُٹھائی۔ جیب سے

سگرٹ کیس نکالا۔ ایک سگرٹ کنور صاحب کو دیا دوسرا خود سلگایا اور چلتے وقت مسعود کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"لو بیٹا مسعود! خدا حافظ۔ جاتے ہیں"

نوکروں کی طرف زور سے سگرٹ کا دھواں اُڑاتا ہوا اور بدھو کا منہ چڑاکر بید ہلاتا ہوا گڈھی سے باہر چلدیا۔

چند منٹ بعد مسعود کو ہوش آیا۔ ایک گلاس پانی پیا جب کچھ حواس ٹھکانے ہوئے تو آخری کوشش کے خیال سے مسز جے رام کے پاس گیا مسز جے رام ابھی تک لال جی کے پاس بیٹھی ہوئی زار و قطار رو رہی تھی اُس نے مسعود کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ مسعود کو یقین کامل ہوگیا کہ اب ہزار کوشش کی جائے مسز جے رام، ایک لفظ نہ کہے گی۔ جس طرح پہلے کتاب میں بند تھا اب یہ راز لالجی کی ماں کے دماغ میں مقفل ہوگیا۔

مسعود نہایت مایوس ہوکر گڈھی سے رخصت ہوا۔ ساڑھے دس بجگئے تھے پونے بارہ بجے ایک گاڑی دہلی جاتی تھی۔ مسعود آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف چلدیا۔ سڑک سے ملا ہوا ایک گھنا باغ تھا۔ ایک شخص یہاں سے نکلا اور بولا۔

"کیوں تمھاری کیا رائے ہے؟"

دیکھا تو پروفیسر سعید یا بہرام تھا۔ مسعود ہکا بکا ہوگیا۔

"بولتے کیوں نہیں؟ بڑے ناقدرشناس ہو میری کارگذاری کی داد کیوں نہیں دیتے ہو؟ دیکھا وقت پڑے پر کیسا کام کرتا ہوں۔ آخاہ! معلوم ہوتا ہے کہ تم ابھی تک خواب خرگوش میں ہو! دیکھا تمھارا کوٹ ایشٹ پرسے میلا ہوگیا ہے۔ آؤ آج

بڑھو جھاڑ دہن۔ کیا تم پروفیسر سعید معلم فلسفۂ سیاست کے وجود پر شک کرتے ہو
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے! تھوڑے دیر میں پروفیسر سے تمہاری ملاقات کرا دوں گا
لو اب خفگی دور کرو! یہ لو اپنا پستول، تم سمجھتے ہو کہ میں نے شاید کارتوس نکال لیے
ہیں! دیکھو ابھی پانچ کارتوس موجود ہیں! ان میں سے ایک مجھے دوسری دنیا
میں بھیجنے کے لیے کافی ہے! مگر مجھے یقین ہے تم اس بڈھے پروفیسر کو صفحۂ ہستی سے
نہ مٹاؤ گے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے اسے جیب میں رکھے رہو پھر کبھی کام آئے گا، مگر دیکھ
بھال کے چلایا کرو۔ پھر لڑکے ہو۔ جوانی کا جوش ہے۔ تم نے مجھے گڑھی میں پہچان لیا
اور یہ دیکھ کر کہ ایک بار پھر مجھ کمبخت نے تمہاری کامیابی میں روڑہ اٹکایا۔ غصہ
آگیا، تین قدم کا تو فاصلہ ہی تھا تم نے پستول نکال دن سے فیر کر دیا۔ مگر میں اس
سے ناراض نہیں ہوا۔ ثبوت چاہتے ہو تو آؤ میں تمہیں اپنے سو گھوڑے کی قوت
والے موٹر کار میں سیر کو لے چلوں۔"

دو انگلیوں سے ہونٹ دبا کر زور سے سیٹی بجائی۔ اس باغ کے کنارے عجب
سین تھا۔ ایک طرف بڈھا پروفیسر دوسری طرف کم سن مسعود۔ پھر بہرام کی بے تکلفانہ
باتیں مسعود سے نہ رہا گیا اور زور سے ہنس پڑا۔

"شاباش! اب تم ہنستے ہو۔ کما کھاؤ گے۔ بات یہ ہے بیٹا مسعود! تم ہو تو
کم سن بچے مگر اپنے آپ کو بڈھوں سے زیادہ سنجیدہ بنائے رکھتے ہو۔ میں جانتا
ہوں کہ تم ذہین ہو، ہوشیار ہو، دلیر ہو صاف بات کہتے ہو مگر تم ہنستے کم ہو"
پھر بالکل سامنے ہو کر کہنے لگا۔

"مسعود اچھا بتاؤ مجھے کس طرح معلوم ہوا کہ تم پروفیسر سعید سے نیلی چھتری کے

متعلق گفتگو کر رہے ہو اور آج صبح تم اور پروفیسر یہاں آنے والے ہو؟ لو میں خود
بتائے دیتا ہوں۔ تم اپنی کامیابی پر خوش ہو کر اپنے دوست نورالدین سے ذکر کرتے ہو
وہ رات کو اپنی محبوبہ سے کہتا ہے اور تم جانتے ہو کہ چاوڑی بازار کے سارے کوٹھے
میری بادشاہت میں ہیں۔ جتنے بیوقوف پولیس والے ہیں وہیں جا کر زیردست ہوتے
ہیں اور چاوڑی بازار کی پریوں سے دل کا حال کہتے ہیں وہ سب میری زرخرید
لونڈیاں ہیں۔ مجھے سب پرستکندہ حال معلوم ہو جاتا ہے۔ تمھارے دوست نے بھی
پولیس والوں کی سی غلطی کی۔ خفا نہ ہو بیچارے نورالدین کا کچھ زیادہ قصور نہیں ہے
اُسے کیا معلوم تھا کہ چاوڑی بازار میں بھی میرا راج ہے۔ خیر آئندہ احتیاط رکھنا۔ تم
بڑے دلچسپ آدمی ہو بھئی کبھی کبھی جی میں آتا ہے کہ تمھیں پکڑ کے خوب جھنجھوڑ ڈالوں۔ تم
ہر بات کو تعجب کی نظر سے دیکھتے ہو۔ اس سے میرا دل بہت خوش ہوتا ہے۔ اُس دن
بھی تم بڑی سنجیدگی سے حالات دریافت کرتے پھرتے تھے۔ چونکو نہیں جس
قاضی جی سے تم نے باتیں کی تھیں وہ میں ہی تھا [illegible] دیکھو تم پھر سنجیدہ ہوتے جاتے ہو
اپنے آپ کو بچہ سمجھو اور خوب کھلکھلا کر ہنسو۔ دیکھو [illegible]
اچھا [illegible] شہزادہ
جرمنی کی [illegible] ایک چھیلنے [illegible] اگر مجھے [illegible] لیا تھا۔"

تھوڑی دیر سے ایک موٹر گاڑی کی آواز آئی۔ بہرام نے [illegible] ہاتھ زور
سے پکڑا اور کہنے لگا۔

"اچھا [illegible] کہ خاموش [illegible] دیکھا [illegible] چاہتے
ہو تو کسی [illegible]

بم پھینکنے والوں سے مقابلہ کرو۔ خلق اللہ کا بھی فائدہ ہوگا۔ نام آوری ہوگی سرکار
سے انعام پاؤگے۔ امتحان پاس کرلوگے تو پولیس میں اچھا عہدہ مل جائے گا اور جلد
ترقی کروگے اور کیا تعجب ہے کہ ایک دن خان بہادر ہو جاؤ۔ بس اب تم مجھے میرے
حال پر چھوڑ دو۔ کیوں؟ بالکل طے ہے نا؟"

پھر دونوں شانے پکڑ مسعود کو بچوں کی طرح ہلایا، گویا اپنی مرضی اور ارادہ
کی مہر اس کے دل پر ثبت کر رہا ہے۔ پھر زور سے ہنسا اور کہنے لگا۔

"مگر بڑی حماقت ہوگی جو یہ یقین کر لیا جائے کہ اب تم میرے منہ نہ لگو گے۔
میں ایک بار پہلے اس کا تجربہ مسٹر جبال کے کمرے میں کر چکا ہوں! تم معمولی آدمی نہیں
ہو! جان جائے آن نہ جائے، تمہارا قول ہے۔ میں چاہوں تو انگلیوں کے دس بارہ
اشاروں سے تمہیں جکڑ باندھ کے اس موٹر کار میں رکھ دوں اور ایسی جگہ بھیج دوں
کہ مہینوں تمہارا پتہ نہ لگے، پھر میں بالکل آزاد پھروں، جہاں چاہے جاؤں، جو چاہے
کروں اور اس بیش بہا خزانہ سے فائدہ اٹھاؤں، جو شاہان دہلی نے میرے لیے جمع
کیا ہے مگر کیا کیا جائے۔ میرا دل ضرورت سے زیادہ نرم واقع ہوا ہے۔ تم پر سختی کرنے کی
طرف طبیعت راغب نہیں ہوتی۔ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ کمزوری ہوتی ہے۔ میں بھی
انسان ہوں میں اپنے دشمنوں سے اس طرح کھیلنا پسند کرتا ہوں جس طرح بلی چوہے
سے کھیلتی ہے مگر تم میرا کر ہی کیا سکتے ہو؟ قبل اس کے کہ تم نیلی چھتری کا راز دریافت
کرکے مجھے شکست دو، تمہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات ہے؟ یا منہ کا نوالا ہے؟
شاہان دہلی کا خزانہ دریافت کرنا کیا آسان کام ہے؟ بھلا [illegible] دس دن محنت
کرنا پڑی جب یہ معمہ حل ہوا۔ تمہیں کم از کم دس برس چاہئیں! آخر تم میں اور مجھ میں

کچھ فرق ہے یا نہیں ؟"

اتنے میں موٹر آ پہونچا۔ گاڑی تھی یا ریل کا پورا ڈبہ۔ بہرام نے بڑھ کے پٹ کھولا۔ مسعود نے پائدان پر قدم رکھتے ہی چیخ ماری۔ گاڑی میں ایک آدمی لیٹا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ بہرام تھا یا پروفیسر سعید! اُسی شکل کا آدمی پٹ کھولے کھڑا تھا۔ بہرام مسعود کی پریشانی کو سمجھ گیا اور زور سے قہقہہ لگایا۔

" مسعود ڈرتے کیوں ہو؟ بڈھا پروفیسر آرام سے سو رہا ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ پروفیسر سے تمھاری ملاقات کراؤں گا۔ دیکھو میں وعدہ کا پکا ہوں۔ اب تم سمجھے، رات کو بارہ بجے مجھے تمھارے گڑھی آنے کا حال معلوم ہوا۔ میں بھی سات بجے صبح یہاں پہونچ گیا۔ جس وقت پروفیسر یہاں سے ٹہلتا ہوا نکلا، میں نے اُٹھا کر سوئی کے ذرا سے اشارے سے بیہوش کر دیا اور اپنی گاڑی میں لٹا دیا۔ کیا بُرا کیا۔ غریب پروفیسر کتابوں کے کیڑے ہوتے ہیں۔ راتوں سونے کو نہیں ملتا، آج میری بدولت کئی گھنٹے سو لیا۔ دماغ تازہ ہو جائے گا اور شام کو لکچر نہایت عمدگی سے دے سکے گا اچھا بڑے میاں! اب ہم تمھیں اس باغ کی مینڈھ پر لٹائے دیتے ہیں۔ کیوں ٹھیک لیٹ گیا نا؟ جو دیکھے گا کوئی غریب فقیر سوتا ہے۔ واہ میاں پروفیسر! تم بھی ہاتھی سے گنّے کھانے چلے تھے۔ خوب! بہرام کو پکڑنے کا ارادہ تھا لو اب پڑے ہوئے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ۔"

یہ بھی طرفہ تماشہ تھا۔ اس وقت یہاں دو پروفیسر تھے بالکل ہمشکل اور ہم وضع۔ ایک باغ کی مینڈھ پر۔ دوسرا بڑی آہستگی اور سنجیدگی کیساتھ اُسے آرام سے لٹانے میں مصروف تھا۔

"اچھا میاں پروفیسر خدا حافظ! سفر خرچ کے لیے کچھ دام تمھاری جیب میں
ڈالے دیتا ہوں اور اپنا کارڈ بھی رکھے دیتا ہوں۔ آؤ مسعود بہت دیر ہوگئی اب
چلیں۔ سنتے ہو شوفر، میل کی رفتار سے چلو۔ آج ہسٹوریکل سوسائٹی کا عام جلسہ
ہے۔ تمام ہندوستان کے تاریخ دان جمع ہوں گے اور پروفیسر سعید کو اس جلسہ میں ایک
مضمون پڑھنا ہے۔ یہ مجھے ابھی تک نہیں معلوم کہ مضمون ہے کیا۔ خیر دیکھا جائیگا۔ اگرچہ
اصلی پروفیسر نہ ہوگا مگر حاضرین جلسہ زیادہ نقصان میں نہ رہیں گے۔ ایک اور شخص بالکل
سعید کی شکل اور وضع میں مضمون پڑھے گا اور شاید اصل مضمون سے اس کا لکچر زیادہ
دلچسپ اور معنی خیز ہوگا۔ فلسفہ سیاست پر میں بھی کچھ رائے رکھتا ہوں۔ آج حاضرین
اُس سے مستفید ہوں گے۔ مجھے ہسٹوریکل سوسائٹی کے سامنے لکچر دینے کا موقع
ہر روز تو ملتا ہی نہیں۔ آج شام کو تفریح کی یہی صورت سہی! اور تیز چلو۔" [illegible] میل
فی گھنٹے سے زیادہ نہیں جا رہے ہو! مسعود! تم ہنسے کیوں؟ جانتے ہو! تم بہرام کے
ساتھ ہو۔ موٹر چلانا شوق ہے۔ اس کی تیز رفتاری سے نہ ڈرو۔ لوگ کہتے ہیں دنیا
بڑی غیر دلچسپ جگہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ زندگی اور دنیا کا قصور نہیں ہے
لوگ خود مردہ دل ہیں۔ میری طرح اگر لوگ بھی زندگی کی قدر سمجھیں تو قدم قدم پر
دلچسپیاں موجود ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے کس قدر لطف کے ساتھ وقت
کٹا۔ تم کنور صاحب سے باتیں کرنے میں مشغول تھے اور میں کھڑکی کے سامنے کھڑا
ہو کر کتاب کے قیمتی ورق پھاڑ رہا تھا۔ پروفیسر جب آ کر ہم سے باتیں کرنے لگے میں
سوچتا تھا کہ وہ تمھیں راز کی باتیں [illegible] لگی یا نہیں۔ بتلا دیا تو میرا کیا حشر ہوگا
سب بنا بنایا کارخانہ برباد ہو [illegible]

کس قدر انتظار تھا! ایک منٹ اور نہ آتا تو مسز جے رام تمھیں حال بتا دیتی! لیکن خیر ہوئی خط وقت پر پہونچ گیا! پھر یہ خیال ہوا کہ مسعود سمجھ جائے گا کہ میری کارستانی ہے۔ مگر مسعود اس قدر زود فہم کہاں تھا۔ اس نے بڑی دیر میں مجھے پہچانا، جب تم نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پستول کا گھوڑا چڑھایا، کیا بتاؤں، میں کس قدر خوش تھا۔ اتنے کم وقت میں اتنی باتیں ہونا، کیا غیر دلچسپ زندگی اسی کو کہتے ہیں لوگ زندہ رہنا اور کام کرنا جانتے ہی نہیں۔ اچھا اب باتیں بہت ہو چکیں میں نیند میں متوالا ہو رہا ہوں، تھوڑی دیر سو لوں۔"

مسعود نے جھک کر دیکھا تو واقعی بہرام کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی، آنِ واحد میں خراٹے لے لیکر سونا شروع کر دیا۔

موٹر کار پوری رفتار کے ساتھ آندھی مینھ کی طرح اُڑی چلی جاتی تھی، کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مسعود نے بہرام کو غور سے دیکھنا شروع کیا اور سوچتا تھا کہ کسی ترکیب سے اِس کی اصلیت کذائی معلوم کی جائے۔ کیا دلچسپ آدمی ہے۔ خدا نے کیا طبیعت دی ہے اور کیا جدت پائی ہے۔ یہ سوچتا سوچتا، اور اپنی ناکامیابی سے پژمردہ ہو کر مسعود بھی اونگھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مسعود جاگا تو دیکھا کہ بہرام ایک کتاب کے مطالعہ میں مستغرق ہے۔ جھک کر دیکھا تو ڈریپر کی تصنیف معرکۂ سائنس و مذہب تھی۔

باب ۱۷

راجہ یدھشٹر اور بہرام

بہرام بالطبع خاموشی پسند تھا۔ دیکھتا سب کچھ، مگر کہتا کم۔ جب کبھی تحریر یا تقریر کا موقع ملتا، اعتدال سے کام لیتا تھا۔ لیکن بعض وقت اپنی کامیابی کے جوش میں، یا نادانستگی میں، ایسے جملے کہہ گزرتا تھا جو اُس کے عام اصول کے خلاف ہوتے تھے۔ مسعود جیسا ہوشیار لڑکا ایسے جملوں سے اگر چاہے تو بہت کچھ کام نکال سکتا تھا۔

چنانچہ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ بہرام مسعود کے چھیڑنے کے لئے، یا اپنی برتری کے ثبوت میں، دو چار باتیں ایسی کہہ گیا جو اُسے نہ کہنا چاہئے تھیں، مثلاً اُس کا یہ کہنا "بہرام جیسے آدمی کو دس دن محنت کرنا پڑی جب یہ مسئلہ حل ہوا۔ تمھیں کم از کم [illegible]" [illegible] وہ نے اس فقرہ کو یاد رکھا اور تمام دن اس پر غور کرتا رہا۔ سوا [illegible] اس کے اور کوئی مقصد سمجھ میں نہ آیا کہ [illegible] راز [illegible] جو کچھ اُسے اس وقت تک معلوم ہوا [illegible] بہرام [illegible] لیکن بہرام کو [illegible] قسم کی کامیابی حاصل ہوئی۔ [illegible] قوت اور [illegible] شخصیت سے مقابلہ کیا اور گھنٹوں [illegible] یہ فیصلہ [illegible] ذلت [illegible] کام بہرام سے ہو سکا [illegible] بلکہ غیر معمولی [illegible]

فراست کا آدمی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسعود بھی کامیاب نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ دس دن کے بجائے دس ہفتے یا دس مہینے صرف ہوں، لیکن ایک بار اس کا ارادہ کرنے کے بعد پیچھے قدم ہٹانا نہ خود اپنی ذلت، بلکہ علی گڈھ کالج کی شہرت کو معرض خطر میں ڈالنا تھا۔ جس وقت اسے خیال آیا کہ کامیابی کی صورت میں اسکے ہم سبق اس کی کس درجہ قدر کریں گے اور اس کے کالج کی کس قدر ناموری ہوگی، یاس انگیز وسوسوں کو جو چپکے چپکے اس کے ارادہ کو کمزور کر رہے تھے خیرباد کہا اور مصمم ارادہ کر لیا کہ ہر چہ بادا باد ایک بار کوشش کرنی چاہیئے تاکہ یہ کہنے کو تو ہو کہ

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے امیر

مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

پروفیسر سعید کا پہلا خط اخبارات میں شائع ہو جانے کے بعد مسعود نے دہلی اور علی گڈھ کے کتب خانوں میں درجنوں کتابیں دیکھ ڈالیں اور رنیلی چھتری کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا اسے ایک مستقل یادداشت کی صورت میں لکھ لیا تھا۔ اسے یہ یقین تھا کہ بہرام کو اس سے زیادہ اور کوئی حالات معلوم نہ تھے لیکن اسنے اپنی ذہانت اور پرچہ کی عبارت سے جو سالک رام نے اس سے چھین لیا تھا، پہاڑ میں راز کو دریافت کر لیا۔ پرچہ اگرچہ مسعود کے پاس نہ تھا مگر اسکا ایک ایک ہندسہ اسکے دل میں النقش کالحجر تھا۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ بہرام کی طرح مسعود بھی کامیاب ہو جائے۔ اب تک تو ابوالفضل کے اصل تحریر شدہ نسخے کی جد پر تمام باتوں کا انحصار تھا۔ لیکن وہ نسخہ ملا تو اس کے کارآمد ہونے سے بہرام اڑا لے گیا۔ یہ دروازہ بھی بند ہو گیا۔ سوال یہ تھا کہ مسعود کیا ذرائع

اختیار کرے اور کہاں سے شروع کرے، یہ معمولی سوال نہ تھا اور غور طلب تھا۔

مسعود نے کوچۂ پنڈت پہونچکر اپنا اسباب باندھا۔ نورالدین کی نادانی کی بدولت جو ناکامی ہوئی اُسکا ذکر تک نہ کیا اور خاموشی کے ساتھ اپنے دوست اور اُنکے والد سے رخصت ہو علی گڈھ جانے کا بہانہ کرکے چلدیا۔ بجاے اسٹیشن جانیکے میڈن ہوٹل پہونچا اور ایک کمرہ کرایہ کا لے کر رہنے لگا۔ کئی دن تک کمرہ بند کیے رہا اور تمام وقت سوچنے اور غور کرنے میں صرف ہوتا تھا، بیٹھے بیٹھے تھک جاتا لیٹ جاتا یا کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ اور بار بار سوال کرتا۔

"بہرام کو دس دن لگے، کیا مجھے واقعی دس سال درکار ہوں گے"۔

مسعود نے دنیا و مافیہا کے خیالات کو دل سے دور کیا اور اپنی کتاب یادداشت اور پرچہ کے ہندسوں پر غور کرنے کے سوا کوئی بات دل میں نہ آنے دی۔ وہ چاہتا تھا کہ دس دن کے اندر کسی فیصلہ پر پہونچ جائے۔ چھ۔ سات آٹھ۔ نو۔ یہانتک کہ دسواں دن آگیا اور مسعود کے لئے ہنوز روز اول اور دہلی دور، کا مضمون تھا لیکن پندرھویں دن ایک خیال اُس کے دل میں بجلی کی طرح کوند گیا، یہ سچ ہے کہ اُسے نیلی چھتری کا اصل مقام معلوم نہیں ہوگیا، مگر اتنے عرصہ کے غور و فکر سے وہ اس نتیجہ پر پہونچ گیا کہ ہو نہو جتنے اہم واقعات موجودہ دہلی کے قرب و جوار میں دریا کے کنارے ہوتے ہیں اُنکا تعلق نیلی چھتری کے راز سے ضرور ہے۔

دہلی کے آباد ہونے کی تاریخ پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کا آباد ہونا ہی دراصل ایک خزانہ کی وجہ سے تھا۔

ہندوؤں کے اعتقاد کے بموجب یہاں راجہ اندر نے دونوں ہاتھ کے

موتیوں کا دان کیا تھا اس سبب سے اس جگہ کو اندرپرست کہتے ہیں۔ جب یدھشٹر اور
راجہ دریودھن سے بگاڑ ہوا تو یدھشٹر نے کسی طرح اس خزانہ کا راز معلوم کر لیا
جہاں سے اندرا کا اس کے راجہ نے موتی نکال کر دان کیا تھا۔ راجہ یدھشٹر نے
یہاں رہنا شروع کر دیا اور دریودھن جیسے راجہ کے مقابلے میں یدھشٹر کو جو کامیابی
ہوئی اس کی اصل وجہ اس خزانہ کا مالک ہونا تھی۔ ایشیا میں مہابھارت کی لڑائی
کو جو امتیاز حاصل ہے وہ کسی دوسرے معرکہ کو نہیں ہے، موجودہ جنگ یورپ سے
پہلے آج تک مہابھارت جیسی کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ یہ لڑائی دراصل اندرپرست
کے میدان کے فیصلہ کے لیے نہ تھی بلکہ اس خزانہ کے قبضہ کے واسطے تھی جو
پانڈوں کی فتح کے بعد راجہ یدھشٹر کے قبضہ میں آیا۔ مہابھارت کے بعد بھی متعدد
معرکہ آرائیاں دہلی کے آس پاس ہوئی ہیں، اگرچہ دہلی آب و ہوا کے لحاظ سے
ہندوستان جنت نشان میں بہترین جگہ نہیں ہے۔ لیکن جس راجہ یا بادشاہ نے قوت
حاصل کی۔ دہلی کے فتح کا خیال کیا اور فاتح نے ہمیشہ دہلی کو اپنا پایہ تخت بنایا۔
راجہ بکرماجیت نے البتہ اجین میں سلطنت کی لیکن بکرماجیت جیسے راجہ کی قوت
کو ایک معمولی جوگی نے درہم برہم کر دیا اور جب بکرماجیت لڑائی میں مارا گیا تو
اس جوگی نے بھی دہلی میں ہی اپنا راج جمایا۔ وہ سمندر پال کے نام سے مشہور ہوا
بہرام سے پہلے اس جوگی نے بھی سالہا اپنی قوت [illegible]
سے خزانہ معلوم کر لیا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ بہرام پہلا [illegible]
اپنی محنت سے اس راز کو دریافت کیا۔ اس خیال سے مسعود کو اور بھی تقویت ہوئی
اور اس نے سمندر پال جوگی کی تھی کی تاریخ [illegible] کی تلاش [illegible]

نزدیک جمنا کے کنارے پایا۔

سلطان محمد تغلق نے [illegible] دولت آباد بسایا اور دہلی کے تمام باشندوں کو بہ جبر وہاں لے گیا اور دہلی ویران ہو گئی لیکن کچھ عرصہ کے بعد پھر دہلی واپس آیا

لودیوں نے ایک بار دہلی کو چھوڑا اور آگرہ آباد کیا، اکبر نے بھی اپنا دارالسلطنت آگرہ بنایا۔ لیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ آگرہ بھی جمنا کے کنارے ہے۔ شاہجہاں پھر دہلی گیا اور لب دریا قلعہ تعمیر کیا۔

غرضکہ جو کچھ معرکہ آرائیاں پچھلے چار ہزار برس میں ہوئی ہیں وہ سب دہلی کے آس پاس جمنا کے [illegible] رہے اس سے یہ قیاس کرنا مشکل نہیں کہ ہو نہ ہو یہ خزانہ دریا کے کنارے سے کچھ دور نہیں ہے۔ لیکن در اصل کہاں ہے اور وہاں تک پہونچنے کا کیا ذریعہ ہے؟"

ایک اور بات جو مسعود کو عجیب معلوم ہوئی، وہ یہ تھی کہ دنیا کے کسی حصے میں ایک جگہ اتنی لاٹیں نہیں پائی جاتیں جتنی دہلی میں ہیں۔ لڑائیاں دوسرے شہروں اور دوسرے ملکوں میں بھی ہوئی ہیں، بادشاہ غالب و مغلوب ہوئے، ایک خاندان تباہ دوسرا برسر حکومت ہوا اور طرح طرح کی یادگاریں قائم ہوئی ہیں لیکن اتنی کثرت کے ساتھ لاٹیں کہیں نہیں ملتیں۔ لوہے کی لاٹ۔ اشوکا کی لاٹ قطب صاحب کی لاٹ۔ فیروز شاہ کی لاٹ۔ ہو نہ ہو ان لاٹوں کو کسی نہ کسی [illegible] اس خزانے سے تعلق ضرور ہے۔ اس [illegible] تقویت [illegible] خود بہرام کے عجیب [illegible]

کھوج ملا ہے، دریا کی طرف جاتا معلوم ہوا اور نور محل کے مقدمہ کے سلسلہ میں جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ بھی اسی کی متقضی ہیں۔ مثلاً نور محل سے سامان چرا کر دریا کے راستے غائب کیا گیا۔ مسعود کے والد کو قید جمنا کے قریب کیا گیا۔ فیروزہ بائی کی لاش دریا سے برآمد کی گئی۔

مسعود کو یقین تھا کہ بہرام نے سوائے اس کے کچھ نہیں کیا کہ پرانی دہلی کے کھنڈروں کی تفتیش کی اور اُس پرزہ کاغذ کی مدد سے اصل راز کو دریافت کرلیا بہرام نے معلوم کرلیا تو کوئی وجہ نہیں کہ مسعود ناکام رہے۔

بسم اللہ کہکر مسعود نے کمر ہمت چست باندھی۔ فقیر کا بھیس بدل ہوٹل سے روانہ ہوا اور جمنا کے کنارے ہولیا اور ایک کشتی کرایہ کرکے دریا دریا متھرا تک چلا گیا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ وہاں سے پیدل واپس آیا۔ ایک دن قطب صاحب کی لاٹ کے متصل کھنڈروں میں گھوم رہا تھا۔ ایک گھوسی مویشی چراتا ہوا ملا۔ وہاں کے حالات پوچھنے کے لئے اس کے پاس گیا۔ ابھی بات بھی نہ کرنے پایا تھا کہ گھوسی نے کہا:۔

"مسٹر مسعود بندگی"

مسعود (تعجب سے) "بیشک میرا نام مسعود ہے لیکن تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

گھوسی "اول تمھارے لبا کبت پر اتنی لمبی داڑھی زیب نہیں دیتی، علاوہ اس کے فقیرانہ کپڑے پہننے اور داڑھی لگانے کے لیے چہرہ پر انکساری اور مسکینیت کے آثار پیدا کرنا ضروری . . . زہو تو آموزنا بھیس اچھا نہیں بدلتے"

"لیکن صرف یہ بات تو مجھے پہچاننے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔"

"مَیں نے آپ کی تصویریں اخبارات میں اکثر دیکھی ہیں اور میں آپ کے حالات سے واقف ہوں۔"

مسعود۔ "تو کیا جس بات کی فکر مجھے ہے اور جس کی وجہ سے حیران و پریشان پھر رہا ہوں، آپ کو اُس سے دلچسپی ہے؟"

"تم دلچسپی لیے پھرتے ہو! میں جب تک بہرام سے انتقام نہ لے لونگا دنیا کا کوئی کام نہ کرونگا۔ بہرام نے نہ صرف میری ذات کو اذیت پہونچائی ہے۔ بلکہ میری شہرت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ مَیں کوئی معمولی پولیس کا افسر نہیں ہوں کہ بہرام بندر کی طرح نچائے۔ بینی مادھو سے مذاق کرنا معمولی بات نہیں ہے۔"

"تو کیا آپ الہ آباد کے مشہور سراغرساں بینی مادھو ہیں؟"

"جی ہاں! لیکن ابکی بار بہرام اور بینی مادھو کی مڈبھیر معمولی بات نہ ہوگی بلکہ ایسا معرکہ ہوگا جسے دنیا مدتوں یاد رکھے گی!"

بینی مادھو کی اس دھمکی میں اس قدر سنجیدگی تھی کہ مسعود کو یقینِ کامل تھا کہ اب بہرام بینی مادھو کے چنگل سے نہ بچ سکے گا۔ اُسے یہ معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا کہ اس کا قیاس غلط نہ تھا اور بینی مادھو بھی بہرام کی تلاش میں انھیں اطراف میں پہونچ گیا۔ تاہم مزید اطمینان کے لیے دریافت کیا۔

"تو کیا آپ کے نزدیک میں صحیح راستہ پر ہوں؟"

"بے شک۔"

"اگر نا مناسب نہ ہو تو مہربانی کر کے مجھے تبلائیے کہ کامیابی کی امید ہے

یا نہیں اور کس بنا پر؟"

"مسٹر مسعود، آپ کو رانی کملا پتی اور چندن ہار کا قصہ یاد ہوگا"

"جی ہاں خوب"

"اور یہ بھی یاد ہوگا کہ اس حیرت انگیز چوری میں بہرام نے ایک خادمہ گلابو سے بڑا کام لیا تھا"

"ہاں یہ بھی یاد ہے۔ وہی گلابو نا جسے ایک کشمیری شال فروش گٹھری میں باندھ کر دہلی سے لے بھاگا تھا"

"تمہارا حافظہ بہت اچھا ہے۔ وہ گلابو معمولی لونڈی نہیں ہے بلکہ بہرام کی انا ہے جس نے بہرام کو دودھ پلایا ہے۔ جہاں کہیں وہ رہتی ہے بہرام کبھی نہ کبھی وہاں ضرور آتا ہے۔ میں نے اس کا پتہ لگایا ہے۔ گلابو مل گئی تو اس کے ذریعہ سے بہرام کا ملنا کیا مشکل ہے"

"لیکن یہ لازمی بات نہیں ہے"

آخر ہونا لڑکے! تم گلابو اور بہرام کے تعلقات کی تفتیش کروگے تو معلوم ہوگا کہ بہرام بغیر گلابو کے بسر نہیں کر سکتا۔ تمھیں یاد ہوگا کہ جب تم نے فیروزہ بائی اور اپنے والد کو شیلی چھتری سے آزاد کیا ہے تو وہاں بھی ایک بڈھی خادمہ کا ہونا معلوم ہوا تھا۔ وہ بھی گلابو تھی۔ بات یہ ہے کہ تم کاغذ کے پرندوں اور کتابوں کے بل بوتے پر کام کرتے ہو اور میں ٹھوس واقعات پر۔ گلابو یہاں سے دو میل کے فاصلہ پر رہتی ہے۔ بہرام اس سے ملنے کبھی نہ کبھی ضرور آئے گا اور میرے پنجے میں پھنس جائے گا اب جاؤ اور اپنا کام کرو۔ یہاں دیر تک ٹھہرنا اور باتیں کرنا

مناسب نہیں۔ بہرام کے چیلے چپاٹے غافل نہ ہوں گے۔"

مسعود سلام کر کے رخصت ہوا۔ مسعود کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی اور وہ خوشی کے مارے اُچھل اُچھل پڑتا تھا۔ بینی مادھو کا اُسی راستہ پر مل جانا معمولی بات نہ تھی اُسے یقین تھا کہ بہرام ضرور ملے گا لیکن مسعود کو صرف بہرام کے ملنے کی اتنی تمنا نہ تھی۔ بہرام سے کئی بار مل چکا تھا۔ ایک مرتبہ مسٹر جپال کے کمرے میں دوسری دفعہ سرد ھنہ میں اور وہاں موٹر کار کے سفر میں جب بہرام سو گیا تو اُسے ہر طرح کا قابو حاصل تھا لیکن اُسے بہرام سے بینی مادھو کی طرح کوئی بدلا لینا نہ تھا۔ نہ وہ بہرام کے جسم یا اُس کی آزادی کو نقصان پہونچانے کا خواہشمند تھا۔ ایک لحاظ سے تو وہ بہرام کی بڑی عزت کرتا اور اُسکی خداداد قابلیت اور فراست پر صد آفرین کرتا تھا۔ مسعود در اصل نیلی چھتری اور شاہان دہلی کے خزانہ کی تلاش میں تھا جس کی وجہ سے بہرام کو اس قدر قوت اور برتری حاصل تھی اُسے یہ معلوم کر کے گونہ اطمینان ہوا کہ بینی مادھو اس کے راستہ میں حائل نہ تھا وہ صرف بہرام کی تلاش میں تھا اور مسعود بہرام کے سرمایۂ ناز اور اُسکی قوت کے منبع و مرکز کی فکر میں۔

تیسرا ہفتہ گذر گیا اور چوتھا آ پہونچا، مگر مسعود ہمت نہ ہارا۔ پُرانی دہلی کا ایک ایک کھنڈر دیکھنا شروع کیا۔ ہر روز میلوں گھومتا اور جس گانوں کے قریب شام ہو جاتی کسی چوپال میں جا کر سو جاتا۔ رات کے وقت گانوں والے الاؤ پر بیٹھتے تو باتوں باتوں میں پوچھتا۔

"کیوں بھئی۔ کبھی تم نے نیلی چھتری کا حال بھی سنا ہے؟"

نیلی چھتری! نیلی چھتری کیسی!! سفید چھتری دیکھی ہے۔ کالی چھتریاں بازار

میں بکتی ہیں۔ یہ نیلی چھتری کیسی؟"

مسعود خاموش ہو جاتا اور صبح کو گانوں سے رخصت ہوتا اور دن بھر گھومتا پھرتا۔ دل میں کہتا تھا "مہینے نہیں برسیں گذر جائیں لیکن نیلی چھتری کا خزانہ ڈھونڈھکر چھوڑوں گا۔"

ایک دن پہاڑوں میں گشت لگا رہا تھا۔ سامنے اونچی ٹیکری پر ایک پرانے قلعہ کے آثار نظر آئے۔ ایسے آثار دہلی میں ہزاروں ہیں اور کوئی خاص بات ایسی نہ تھی لیکن سہ پہر کا وقت تھا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ قصد کیا کہ ٹیکری پر چل کر کچھ ناشتہ کرنا چاہیئے۔ دریائے جمن کا نظارہ کرنے کے لیے یہ ٹیکری بہت موزوں تھی۔ آہستہ آہستہ ٹیکری پر چڑھا۔ ویران قلعہ کے ارد گرد گھوما مگر کوئی جگہ بیٹھنے کے لیے پسند نہ آئی۔ قلعہ کی پشت پر جمنا کی طرف ٹیکری کی گگر دور تک چلی گئی تھی۔ گگر کے خاتمہ پر تھوڑی جگہ مسطح تھی وہاں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ دریا کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آئے اور مسعود کو غنودگی شروع ہوئی۔ چند قدم پر کسی فقیر کی پرانی کھو نظر آئی جس میں پتوں کا انبار لگا تھا مسعود پتوں کے نرم بستر پر لیٹ کے سو گیا۔ آنکھ کھولی تو غروب آفتاب کا وقت قریب تھا۔ اپنے ارد گرد چاروں طرف دیکھنا شروع کیا، کھو کی دیواروں اور فرش پر حرفوں کے نشان نظر آئے اور کچھ عجیب قسم کی شکلیں۔ لیکن دہلی کے درو دیوار پر ہزاروں کتبے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ پرانی دہلی کا ایک ایک ذرہ کسی تاریخی واقعہ کی شہادت دیتا ہی تو چنداں بیجا نہ ہوگا۔ لیکن فرش پر ایک گول سوراخ کے دونوں طرف پرانی ہندی کے حروف نظر آئے۔

ہ ۵ ا ۲

غور سے دیکھا تو اُن کی شکل بالکل اُن حروف کی تھی جو اُس پرزہ کاغذ پر تھے جسے سالک رام نے اُس سے چھین لیا تھا اور جس کی مطابقت رسالۂ نیلی رواق کے نقشہ سے ہوتی تھی۔

مسعود چونک پڑا۔ تمام بدن میں سنسنی پیدا ہوئی اور چاہتا تھا کہ جو راز اِن حروف میں پوشیدہ ہے اُچک لے جائے، جیب میں ہر وقت اُس پرزہ کاغذ کی نقل رکھتا تھا نکال کے مقابلہ کیا۔ تو (سا) ا ب اور (جا) اس بالکل مطابق پایا۔

۷	۶	۲۰۰	۱۰	۸۰
	۴۰	۲۰	۱۰	۲
	۴	۱	۳	۱
۵	۱	۳	۰	۰

۶۱۸ + ۱۰۰

⊙ ۳۵۲⊙۵۹ ⊞ ۳۳ ▭ ۲۷۸ H ۵ ا

اس جوش کی حالت میں مسعود باہر نکلا اور ٹہلنا شروع کیا کبھی قلعہ کے کھنڈر کی طرف جاتا اور پھر کھو کی طرف دوڑتا۔ ایک گھوسی اپنی بھینس لیے گانوں کی طرف جا رہا تھا، دوڑ کے گیا اور پوچھا۔

"کیوں بھئی اِس جگہ کا کیا نام ہے؟"

گھوسی "بیگم آباد"

"بیگم آباد! بیگم آباد تو میرٹھ کے ضلع میں ہے"

"ہمارے باپ دادا کہتے تھے کہ اس ٹیکری پر کسی بیگم نے یہ قلعہ بنایا تھا جب سے اس ٹیکری کا نام بیگم آباد ہوگیا۔"

"اور ٹیکری کے کنارے جو کھوہ ہے اُسکا کیا نام ہے؟"

"نام وام تو جانتا نہیں۔ ایسی کھو پہاڑیوں میں بیسوں ہیں۔ کسی فقیر کی کھو ہوگی۔"

فقیر کا نام سنکر مسعود کے کان کھڑے ہوئے، فوراً ٹیکری پر لوٹ آیا۔ دل میں یہ سوچنے لگا کہ کہیں یہ کھو سمندر پال جوگی کی تو نہیں ہے جس نے راجہ بکرما جیت کو شکست دے کر دہلی کی بادشاہت پر قبضہ کیا تھا! اس خیال نے مسعود کے دل میں دھڑکن پیدا کی اور تمام بدن میں رعشہ پیدا ہوگیا۔ مسعود کی عجب کیفیت تھی لیکن کسی قدر طبیعت سنبھلی تو زمین پر لیٹ گیا اور کہنے لگا:-

"کیا میں پاگل ہوگیا ہوں۔ ایک گھنٹہ سے پاگلوں کی طرح ناچتا پھرتا ہوں! بہرام اس حالت میں دیکھے تو کیا ہو؟"

جب تک سورج نہ ڈوب گیا مسعود بالکل بے حس و حرکت پڑا رہا۔ تاریکی ہونے لگی اور شام کا ستارہ نکلا۔ مسعود پیٹ کے بل کھسکا اور ٹیکری کے کنارہ پر عین کھوہ کے اوپر پہونچا اور جھاڑی کو دبا کر سر اُچکایا۔ داہنی طرف غور کر کے دیکھا تو دور سے فیروز شاہ کی لاٹ نظر آئی۔ بائیں طرف نظر دوڑی تو حیتر گڈھی کے کنگرے دکھائی دیے! اب کیا تھا۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری زنجیر کی سب کڑیاں ملنے لگیں!۔

سامنے دیکھا تو کچھ فاصلہ پر ایک دوسری ٹیکری نظر آئی۔ اُسپر بڑی بھاری

چٹان کا ڈھیر شام کی تاریکی میں چھتری کی شکل کا معلوم ہوتا تھا! مگر اُس ٹیکری کے چاروں طرف گہرے گہرے غار تھے اور سوائے چیلوں اور گِدوں کے اُس کی چوٹی تک کسی کی رسائی نہ تھی، مسعود کو اب کوئی شک باقی نہ تھا کہ شاہان دہلی کا خزانہ اِس چٹان کے نیچے پوشیدہ ہے! مسعود بے صبری کے ساتھ اس ٹیکری کو دیکھ رہا تھا کہ اگر بس چلے تو ابھی ناخون سے نوچ کر خزانہ تک پہونچ جائے بار بار آس پاس کی گھاس کو ہاتھ میں پکڑتا اور کلکلا کے کھینچتا۔ مسعود کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ شفق پھولی اور آسمان پر عجیب عجیب شکل کے منظر بن گئے۔ کہیں پہاڑ کہیں جنگل کہیں سونے چاندی کے دریا۔ جمنا میں بجائے پانی کے گلال کا رنگ نظر آنے لگا۔ لیکن یہ سب کچھ ٹیکری کے اُس پار تھا اور ٹیکری نیلی رنگ کی ہو گئی!!۔

باب ۱۸

حملہ کی تیاریاں

جب خوب اندھیرا ہوگیا، مسعود اپنی جگہ سے اُٹھا اور تین چار میل کے فاصلہ پر ایک پُرانے مقبرہ میں مقیم ہوا۔ جب قدرے سکون ہوا، جھولی میں سے موم بتی نکال کے جلائی۔ کاغذ کا تعویذ کھولا اور سامنے رکھا۔ اس قدر معلوم ہو جانے کے بعد زنجیر کا پورا سلسلہ قائم کرنا کیا مشکل تھا۔ اب اسے یقین ہوا کہ اس پُرزہ کاغذ کا ایک ایک نقطہ اور ہر ایک ہندسہ معنی سے خالی نہیں ہے حروفِ ابجد سے حساب لگایا تو پہلی سطر سے فیروز دوسری سے بیگم تیسری اور چوتھی سے آباد شاہ۔ پھر ۱۰۰ اور ۶۱۸ کو جوڑا تو نیلی چھتری بنا۔

"اُف! کس قدر غلطی ہوئی۔ پہلے کیوں نہ خیال کیا۔ پہلی اور دوسری سطر کو ایک ساتھ ملا کر فیروز بیگم سمجھنا اور اس سے فیروزہ بائی خیال کرنا کیسی بڑی غلطی تھی! در حقیقت پہلی سطر کو چوتھی سطر سے ملا کر پڑھو تو فیروز شاہ بنتا ہے، اور دوسری اور تیسری کو ملاؤ تو بیگم آباد ہوتا ہے۔ یہی قلعہ بیگم آباد تو ہے جہاں سے نیلی چھتری کا نظارہ ہوتا ہے اور دوسری طرف فیروز شاہ کی لاٹ دکھائی دیتی ہے۔ میں بھی کتنا بڑا احمق ہوں۔ اس تعویذ کے ہندسوں کا سوائے اس کے اور کچھ مطلب نہیں ہے کہ بیگم آباد کی ٹیکری سے دیکھو تو ایک طرف نیلی چھتری نظر آئے اور اُس کے دوسری طرف رُخ پھیرو تو فیروز شاہ کی لاٹ اور پھر سامنے دیکھو تو اصل خزانہ کی جگہ، اب اس میں کچھ شک نہیں کہ

میں نے اصل مقام معلوم کر لیا ہے! لیکن خزانہ تک پہونچنے کا راستہ بھی دریافت طلب ہے۔ ہو نہ ہو آخری سطر کے حرفوں اور ہندسوں سے اس کا پتہ چلتا ہے۔"

⊙ ۳۵۲ ⊙ ○۹ ⊞ ۳۳ ▭ ۲۷۸ ⊢ ○ ᔑ

بظاہر مسعود کا قیاس صحیح معلوم ہوتا تھا۔ فقیر کی کھو میں اس راز کی کنجی تھی۔ وہاں سے غالبًا کسی طرف کوئی راستہ ہوگا جس کی راہ سے کسی تہ خانہ میں پہونچکر ٹیکری کے نیچے نیچے سوتیا کے پار جا سکتے ہیں۔ کیونکہ نیلی چھتری کی ٹیکری پر کسی انسان کا چڑھنا ناممکنات سے تھا۔ یہ دروازہ کہاں اور کس طرف ہے؟ کھو میں ۱ ۲ اور ᔑ جسے یورپ کے محققوں نے سمندرپال جوگی کے دستخط سمجھا ہے۔ در اصل کسی نامعلوم راستہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

دوسرے دن بیگم آباد کے قرب و جوار میں لوگوں سے پوچھتا پھرا کہ کسی جگہ کوئی اور کھو یا کوئی پرانا ٹوٹا ہوا دروازہ تو نہیں ہے۔ لیکن کوئی معقول جواب نہ ملا۔ پھر جوگی کی کھو کے کتبہ کی نسبت پوچھا تو جواب ملا کہ کسی سیّاح نے یہاں قیام کیا ہوگا اور چلتے وقت کوئی نشانی بنا دی۔ فرانس کے مستشرق ماسیو لی بان نے البتہ اس جگہ کو سمندرپال جوگی کی کھو قرار دیا ہے، اور ᔑ، ۱ ᔑ سے سمندرپال جوگی کے شروع کے دو حرف سمجھا ہے۔ لیکن جو علم مسعود کو تھا وہ فرانس کے عالم کو نہ تھا، کہ یہ جگہ شاہانِ دہلی کے خزانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

سہ پہر کے قریب کھو میں واپس آیا۔ اور حرفوں کو خوب ملا ملا کے دیکھا۔ گمان تھا کہ شاید یہ حرف پتھر کے دستے ہیں جن کے کھسکانے سے کوئی دروازہ کھل جائے گا لیکن کامیابی نہ ہوئی

پھر اچانک خیال آیا کہ اگرچہ یہ نشان ہندی کے ۸ اور جا سے مشابہ ہیں مگر اِن حرفوں پر معمولی لکیر نہیں ہے۔ شاید ان حرفوں پر کھڑا ہونے سے یہ کمی پوری ہو اور بدن کے بوجھ سے کچھ اثر ہو۔ حرفوں پر دونوں پیر رکھ کر کھڑا ہوا، کچھ اثر نہ ہوا مگر اُس کی ناک کی اونچائی کے عین مقابل ایک سوراخ نظر آیا۔ اپنی لاٹھی سے جالے وغیرہ صاف کیے تو روشنی آنے لگی۔ دیکھا تو قلعہ کی ٹیکری صاف نظر آتی تھی!۔

اب وہ سمجھا کہ اِن حرفوں سے سوائے اس کے کوئی مطلب نہ تھا کہ اُن پر کھڑے ہو کر راستہ کی سمت معلوم ہوتی ہے! پھر اِس سوراخ میں سے بغور دیکھنا شروع کیا سامنے ٹیکری کی جڑ میں پُرانی عمارت کے آثار معلوم ہوئے اور پتھر کی بڑی بڑی چوپہل اینٹیں۔ مسعود کھوہ سے نکلا اور قدم سے ناپتا ہوا دیوار کی طرف چلا اور ۲۷۸ قدم چل کے ٹھہر گیا اور یہاں جو پتھر تھا اُس پر نشان بنا دیا۔

پھر ۳۲ قدم بائیں طرف دیوار کے کنارہ پر چلا تو ایک پتھر کے چوپہل ٹکڑے پہ چوپارہ + نشان اُبھرا ہوا بنا تھا، مسعود نے جلد جلد اُس کے کنارے صاف کیے آس پاس سے گھاس پھوس نوچ کر پھینکا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس نشان کے ایک ایک بازو کو پکڑ کر ہر طرف زور لگایا، نیچے کی جانب کچھ سرکنا شروع ہوا۔ ایکبار مسعود نے لچکچا کے زور لگایا تو کچھ گھڑگھڑاہٹ محسوس ہوئی، گویا کوئی لوہے کی چیز رگڑ کھا رہی ہے۔ تیسرے بار جھٹکا دیا تو کھٹ سے آواز آئی گویا کوئی کھٹکا گرا، اور دو گز کے فاصلہ پر ایک دروازہ کھُل گیا!! جو اینٹیں ساتھ نظر آتی تھیں دراصل دروازہ کے ساتھ پیوستہ تھیں اور اُسی کے ساتھ پیچھے کھسک گئیں۔ ایک تہ خانہ نظر آیا اور سر ہوا

جھونکا مسعود کے مُنھ پر لگا۔ مسعود نے لپک کے دروازہ کا پٹ پکڑا اور فوراً بند کر دیا کہ کوئی دیکھ نہ لے!۔

اس انکشاف سے مسعود پر عجیب حالت طاری ہو گئی۔ آنکھوں کے ڈھیلے باہر نکلے پڑتے تھے، کنپٹیوں کی نسیں خون کے زور سے پھٹی جاتی تھیں۔ کانوں میں تاشے بجنے لگے۔ اس عالمِ خیال میں طرح طرح کے مناظر دکھائی دینے لگے کبھی وہ کوروں اور پانڈوں کو نیم برہنہ ہاتھ میں تیر کمان لیے دیکھتا کبھی ایک جوگی کے گیروے کپڑے دکھائی دیے۔ اس کے بعد پٹھانوں، مغلوں تاتاریوں کی خوفناک صورتیں نظر آئیں، جو گویا اس تہ خانہ پر قبضہ کرنے کے لیے لڑتے اور ایک دوسرے کو مارتے ہیں۔ سین بدل گیا اور ہمایوں اکبر شاہ جہاں کی صورتیں سامنے آئیں آخر میں بہرام اور اُس کے پیچھے خود مسعود! اس حالت میں غشی طاری ہو گئی اور مسعود بیہوش ہو کے گر پڑا

جو کچھ مسعود تنہا کر سکتا تھا کر چکا۔ اب بہرام کی قوت کے مرکز پر تنِ تنہا حملہ کرنا ایسا ہی تھا، جیسا کہ شیر کی کچھار میں جانا۔ مسعود قطب صاحب واپس آیا فوراً اپنی تحقیقات اور کامیابی کے مفصل واقعات قلمبند کیے اور ایک لفافہ میں بند کر کے افسرِ اعلیٰ پولیس کے پاس بھیج دیے۔ اپنا پتہ تحریر کیا اور مدد کی درخواست کی۔

رات کو نقیر کی کھوہ میں آرام کیا، بار بار دروازے کی طرف دیکھتا مگر کسی کے آنے جانے کی کچھ آہٹ نہ معلوم ہوئی جب ذرا آنکھ لگی تو خواب میں دیکھا کہ لوگ اُس کی طرف بڑھے چلے آتے ہیں۔ کوئی دھمکاتا ہے، کوئی تلوار دکھاتا ہے

کوئی بندوق اور پستول کی نال اٹھاتا ہے۔ پھر چونک پڑتا اور اپنے چاروں طرف دیکھتا اور کچھ نظر نہ آتا۔

علی الصباح اٹھا اور قطب صاحب جاکے ناشتہ کیا اور سو گیا۔ شام ہو جانے کے بعد پھر کھو میں آیا اور تہ خانہ کے دروازہ کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑا رہا۔ بہت رات جا چکی تو اُسے دروازہ کھلنے کی آواز معلوم ہوئی ۵-۶ آدمیوں کو باہر نکلتے دیکھا۔

یہ لوگ کچھ بوجھ کندھوں پر رکھے ہوئے تھے اور کھیت کے راستہ سے دریا کی طرف چلے گئے۔ مسعود نے کچھ دور پیچھا کیا مگر سڑک پر ایک موٹر کار کی آواز آئی اور آدمی غائب ہو گئے۔ مسعود پھر اپنی جگہ واپس آیا۔

تھوڑی دیر بعد کچھ اور لوگ تہ خانہ سے سامان لیے ہوئے نکلے اور دو منٹ کے بعد موٹر کی آواز آئی۔ مسعود کی بیقراری کا اندازہ نہ تھا، مگر تنہا کیا کر سکتا تھا، کئی رات کا جاگا ہوا تھا۔ قطب صاحب واپس آیا اور سو گیا۔ دس بجے کے قریب سو کر اٹھا۔ باہر جانے کے لیے تیار تھا کہ ایک آدمی نے لفافہ پیش کیا۔ خط پڑھ کے لانے والے کو بغور دیکھا اور قہقہہ لگا کر بولا۔

"شیر سنگھ صاحب! آج آپ نے کمال کا بھیس بدلا ہے۔ جب تک آپ کے افسر اعلیٰ کے خط سے آپ کے آنے کا حال نہ معلوم کر لیا۔ مجھے گمان بھی نہ ہوا کہ خط کا لانے والا معمولی چپراسی نہیں بلکہ خفیہ پولیس کا دماغ ہے۔ کہیے کنور صاحب مزاج تو اچھا ہے؟"

"جب تک بہرام کی کلائی میں ہتھکڑیاں نہ دیکھ لوں مزاج کا حال نہ پوچھئے

"لیکن یہ کیسے سمجھ لیا کہ بہرام گرفتار ہو جائے گا؟"

"اب کی بار بچ کے کہاں جائے گا؟"

"ایسا بیسیوں دفعہ ہوا ہے"

"لیکن آج دوسری حالت ہے، ہمیں اس کی کچھار معلوم ہو گئی ہے۔ اور اب بچکر نکلنا محال ہے"

"لیکن کنور صاحب بہرام پھر بہرام ہے۔ اُس نے ایسے موقع کے لیئے نکاس کا کوئی راستہ ضرور رکھا ہوگا رات کو میں نے کئی آدمی تہ خانہ سے نکلتے دیکھے۔ ممکن ہے کہ بہرام بھی اُنھیں میں ہو۔ یہ البتہ صحیح ہے کہ بہرام اگر نہ بھی ملا تو شاہانِ دہلی کا خزانہ تو مل ہی جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ بیشک اصل چیز یہ خزانہ ہے۔ اس کوشش میں اگر بہرام بھی مل جائے تو کیا کہنا بیک کرشمہ دوکار"! پھر بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"مسٹر مسعود حسن۔ لیکن اس معاملہ میں بڑی احتیاط اور خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ اور بڑا سخت حکم ملا ہے"

مسعود۔ "کیا مرزا رحیم بیگ کا حکم ہے؟ یا آپ کے افسر اعلیٰ پولیس کا؟"

"نہیں اُن سے بڑے رتبہ کے افسر کا"

"چیف کمشنر؟"

"اور اونچے جاؤ"

"وائسرائے بہادر؟"

ستبِ سنگھ نے آہستہ آہستہ کہا۔

"دوستو! کل شام کو وائسریگل لاج میں طلب کیا گیا۔ بڑے لاٹ صاحب مع اپنے تمام کونسل کے موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ اس کے متعلق ولایت سے بھی بذریعۂ تار استفسار کیا گیا، کیونکہ دراصل شاہان دہلی کا خزانہ بغیر شاہی اجازت کے کوئی نہیں کھول سکتا یہ معاملہ نہایت سنجیدگی اور راز داری کا ہی۔ جنگ کی وجہ سے زر نقد کی جس قدر ضرورت ہی وہ تمھیں معلوم ہی۔ علاوہ اس کے ایسا پوشیدہ اور مضبوط مقام نئے قسم کے آلات بنانے یا تجربہ کرنے یا سامانِ جنگ رکھنے کے لیے موزوں ہی۔ غرضکہ اسے سلطنت کا پوشیدہ سلح خانہ اور خزانہ سمجھنا چاہیے!"

مسعود: "لیکن اس کا پوشیدہ رہنا کس طرح ممکن ہے۔ اگلے وقتوں میں سوائے بادشاہ کے اور کسی کو اس راز کی خبر نہ تھی۔ آج ہم کئی آدمی جانتے ہیں علاوہ ہمارے بہرام اور اُس کے ساتھی۔"

"پھر بھی یہ ضروری ہی کہ جبتک ہو سکے اس راز کو عوام تک نہ پہونچنے دیا جائے"

"لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بہرام اس قلعہ کو بغیر لڑے بھڑے حوالہ کر دے گا کچھ چھیڑ چھاڑ ضرور ہو گی، بیسوں آدمی مل کے اس پر حملہ کریں گے۔ گاؤں والے یہ سب دیکھیں گے پھر کیسے یہ بات چھپ سکتی ہی؟"

"یہ کچھ مشکل نہیں۔ ہم یہ مشہور کریں گے کہ اسکول کے ایک طالبعلم کو پہاڑی میں ایک کھو نظر آئی جو پُرانی معلوم ہوتی ہے۔ کسی اولیا یا بزرگ کی کھو سمجھ کر سرکار کا محکمہ آثار قدیمہ اُسے محفوظ رکھنا چاہتا ہے، جس طرح دہلی کی اور بہت سی عمارتیں اور کھنڈر محفوظ کئے گئے ہیں"

"کہتے صحیح ہو۔ اس قسم کا تہ خانہ دہلی کے کھنڈروں میں نئی چیز نہیں ہی"

"اس لیے یہ مناسب ہے کہ میں اور میرے دس بارہ جوان مزدوروں کا بھیس بدل کے موقع پر پہونچیں گے اور میں خود تنہا یا کسی کو ساتھ لے کر جیسا مناسب ہوگا اندر داخل ہوں گا۔ اصل حملہ اس راستہ سے ہونا چاہیئے اگر بہرام چھتری میں موجود نہ ہو تو کسی بہانہ سے اُس کا وہاں سے آنا مشکل نہیں۔ اور اگر چھتری میں ہوا تو دیکھنا . . اب کی بار بغیر پکڑے یا ہلاک کیے باز نہ آؤں گا!"

"لیکن اگر دریا کی طرف اُس نے کوئی راستہ نکاس کا رکھا ہو تو کیا ہوگا؟"

"یہ سب انتظام کر چکا ہوں، میرے آدمی کشتیوں میں بیٹھے ہوں گے اور فوراً پکڑ لیں گے"

"اور اگر تمھارے آدمیوں کے ہاتھ نہ آیا اور مچھلی کی طرح کسی تیز کشتی میں بیٹھ کر نکل بھاگا تو کیا ہوگا؟"

"اس حالت میں چند منٹ میں جمنا کے تلے کی سیر کرتا ہوگا"

"یہ کس طرح؟"

"دریا کے پار اونچے ٹیلے پر میکسم توپخانہ کی ایک باتری مقیم رہیگی۔ یہاں سے دریا میں ہر طرف فیر ہو سکتا ہے۔ یہ سب انتظام ہو جائے گا۔ تم اطمینان رکھو، وائسرائے اور بڑے جنگی لاٹ نے مجھے پورا اختیار دیدیا ہے جس رجمنٹ کو چاہے بُلا لوں، جس توپخانہ کو مناسب سمجھوں کام میں لاؤں۔ لیکن ہماری اول کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ آہستگی اور خاموشی اور بغیر شور و غل کیے شاہی خزانہ پر قبضہ ہو جائے"

"کنور صاحب! مَیں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ آپ نے سب باتوں کا

انتظام کر لیا۔ بہرام کس قدر ڈینگیں مارے گا، جب یہ دیکھے گا کہ اس کی گرفتاری کے لیے توپخانے اور فوجیں جمع ہوئی ہیں۔"

"مسٹر مسعود مبارک باد کے مستحق آپ ہیں۔ یہ سب کچھ آپ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ سرکار کے نزدیک جو کچھ آپ کی قدر و منزلت ہو گی وہ بیان سے باہر ہے۔ خود وائسرائے آپ کا شکریہ ادا کریں گے اور کیا تعجب ہے کہ حضور ملک معظم بھی شاباشی کا تار بھیجیں۔"

آپ کی بڑی مہربانی۔ یہ بالکل اتفاق کی بات ہے، میں نے کیا ہی کیا ہے؟ لیکن یہ کہیے کہ کام کب شروع کیا جائے گا؟"

"کل"

"رات کے وقت؟"

"نہیں، دن کے دس بجے۔ آپ مجھے بیگم آباد کی کھو میں ملیں۔"

"بہت بہتر۔ تسلیم۔"

باب ۱۹

حملہ

دوسرے دن پونے دس بجے کنور شب سنگھ، ۱۲ جوان، مزدوروں کے بھیس میں ساتھ لئے موقع پر پہونچ گیا اور مسعود کو موجود پایا۔ ہر شخص کام کی اہمیت کے خیال سے خاموش اور متفکر تھا۔ مسعود سب سے زیادہ متاثر معلوم ہوتا تھا۔ شب سنگھ نے مسعود کو اِس حالت میں پاکر کہا:۔

"مسعود! خیر تو ہے؟ تم اِس قدر متوحش کیوں ہو! تمھارا چہرہ زرد ہے اور بار بار کانپ اُٹھتے ہو"

"کنور صاحب! معاف کیجیے۔ آپ کی حالت مجھ سے بھی زیادہ ابتر نظر آتی ہے۔ خیریت یہ ہے کہ اپنا چہرہ آپ خود نہیں دیکھ سکتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موت کے مُنھ میں جا رہے ہو اور جاں کنی کا وقت ہے"

دونوں زمیں پر بیٹھ گئے۔ شب سنگھ نے جیب سے رومال نکال کے پسینہ پونچھا اور کہا "خوف کی وجہ سے میری یہ حالت نہیں ہے۔ معلوم نہیں کیا بات ہے جب کبھی بہرام کو پکڑنے کے قریب میں ہوتا ہوں، میری یہی کیفیت ہوتی ہے۔ دل بیٹھا جاتا ہے"

مسعود نے لیمونیڈ کی بوتل جھولے سے نکالی "لیجیے لیمونیڈ پیجیے۔ اب ٹھیک دس بجے ہیں۔ آئیے کام شروع کریں"

"بسم اللہ! یہاں ہمیں کوئی دیکھتا تو نہیں؟"

"جی نہیں اطمینان رکھیے، ہر طرف پہاڑیاں آڑ کئے ہوئے ہیں اور سامنے کھادر۔"

مسعود دیوار کے قریب گیا اور پہلے کی طرح اینٹوں کو دبایا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ شب سنگھ نے جیبی لالٹین روشن کی اور آگے بڑھ کے دیکھا یہاں سے ٹیکری کے نیچے نیچے دور تک سرنگ گئی تھی، فرش رنگین چوپہلو سلوں کا تھا۔ کچھ آگے بڑھے زینہ نظر آیا۔ دونوں ساتھ ساتھ باحتیاط تمام نیچے اُترے۔ مسعود نے گنا تو ساٹھ سیڑھیاں تھیں جو صدیوں کے استعمال سے بیچ میں گھس گئی تھیں۔

شب سنگھ "آہا!"

مسعود "کیا ہے؟"

"دروازہ"

"لیکن مسلم لوہے کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے، اِس کا کھولنا آسان کام نہیں"

"لیکن اس میں نہ کوئی دستہ ہے نہ کنڈا۔ کھلے گا کس طرح؟"

"سب دروازے کھلنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ یہ بھی کسی نہ کسی طرح کھل جائے گا، اِس کے کھولنے کا کوئی پوشیدہ طریقہ ہوگا۔"

"لیکن ہمارے پاس اس راز کی کنجی نہیں ہے۔"

"مَیں اس کنجی کو ڈھونڈھ نکالوں گا۔ ذرا صبر کیجیے۔"

"آخر کس طرح؟"

"وہی تعویذ، آخری سطر میں اس معمّہ کے حل کرنے کی ترکیب ہے۔ جو آدمی یہ ترکیب

جانتا ہو، اُسے دروازہ کھولنا کیا مشکل ہے؟"

"تمھارے نزدیک کچھ مشکل ہی نہیں! مجھے تم سے اتفاق نہیں" پھر کاغذ کا پرزہ کھول کر مسعود کو دکھایا "یہ دیکھو ٥٩ کا ہندسہ اور ایک گول نشان جس میں ایک نقطہ بنا ہے۔ اِس سے تو کچھ مدد ملتی نظر نہیں آتی!"

مسعود "اب میں سمجھا دیکھو دروازہ پر چاروں طرف لوہے کی گول ٹکیاں اور اُن کے بیچ میں بڑی گل میخیں ہیں، تعویذ میں گول نشان ⊙ اور اُسمیں نقطہ سوائے اُس کے اور کچھ مطلب نہیں رکھتا کہ اس کونے والی گُل میخ کو داہنی طرف کھینچا جائے"

شب سنگھ (خوب زور آزما کر) "مگر یہ میخ تو بالکل جنبش نہیں کرتی"

مسعود "لیکن ٹھہریے۔ ہم اس وقت ساٹھویں سیڑھی پر کھڑے ہیں اور تعویذ میں ٥٩ تحریر ہے۔ یہ بے کار ہندسہ نہیں۔ مہربانی کر کے اُنسٹھویں سیڑھی پر کھڑے ہو جائیے اس کے نیچے کوئی کمانی ہوگی جس کے دبنے اور کیل کے کھسکانے سے دروازہ کھلتا ہوگا!"

شب سنگھ ایک سیڑھی اوپر کھسک گیا۔ مسعود نے گل میخ کو زور سے داہنی طرف ہٹایا۔ کھٹا کا ہوا۔ چٹخنی نیچے گرنے کی آواز آئی۔ دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا!

مسعود "دیکھا! دروازہ کیسی آسانی سے کھل گیا، اب ہم قلعۂ بیگم آباد کے بالکل نیچے ہیں"

اس حصّہ میں ایک سوراخ سے روشنی آتی تھی۔ قریب جا کر دیکھا تو وہاں سے نیلی چھتری صاف نظر آنے لگی۔ اس کے ساتھ دریائے جمن کا نظارہ بھی ہوتا تھا۔ یہ جھروکا اِس موقع سے بنایا گیا تھا کہ یہاں بیٹھ کر ہر طرف کا نظارہ بخوبی

ہوسکتا تھا گویا نیلی چھتری کے سنتری کے لیے ہی بنا تھا۔

"اور آپ کا توپخانہ اور کشتیوں کا بیڑہ کہاں ہے؟"

"وہ دیکھو سامنے ٹیکری پر دو ایک آدمی خاکی وردی پہنے پھر رہے ہیں۔ توپخانہ وہیں کہیں چھپا ہوگا۔ کشتیاں اس گھوم کی آڑ میں ہیں، لیکن ہیں گھات میں۔"

نیچے اُترنے کے لیے زینہ بنا تھا۔ کچھ دور تک تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر روشنی کے لیے جھروکے بنے تھے، لیکن جہاں سے پانی کی سطح شروع ہوئی سوراخ نظر نہ آئے۔ مسعود با آواز بلند سیڑھیاں گن رہا تھا۔ ۳۰۳ نمبر کی سیڑھی پر پہونچ کے زینہ ختم ہوگیا اور پہلے جیسا مضبوط دروازہ نظر آیا۔

مسعود "جس طرح پہلا دروازہ کھلا یہ بھی اُسی طرح کھلے گا، تعویذ میں ۳۰۲ تحریر ہے اور ایک مستطیل لوہے کا ٹکڑا اُس پر گل میخ - یہ دیکھو بالکل اس شکل کا۔"

دروازہ گل میخ کھسکانے سے فوراً کھل گیا۔ سامنے دور تک سرنگ چلی گئی تھی مگر جابجا راستہ میں پُرانے وضع کے فانوس جل رہے تھے۔ دیوار کے کناروں سے پانی رس کر نالیوں میں بہ رہا تھا۔

"اب ہم سطح دریا کے نیچے ہیں۔ آئیے آگے بڑھیں"

شت سنگھ "چلئے۔ یہ تو دیکھئے، فانوس اگرچہ پُرانی وضع کے ہیں، لیکن بدمعاشوں نے گیس کی روشنی کے مینٹل لگا رکھے ہیں۔" دور تک خاموشی کے ساتھ چلے گئے۔ سرنگ کے دوسرے سرے پر ایک اور زینہ ملا جسکی سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں۔

مسعود: "اب یہاں سے نیلی چھتری پر چڑھنے کا راستہ شروع ہوتا ہے"

شب سنگھ: "لیکن اُدھر تو دیکھیے، اس قسم کے دو زینے اور بنے ہیں۔ غالباً اِس لیے کہ اگر ایک راستہ بند ہو تو دوسرے سے نکل بھاگیں، بدمعاشوں نے سب قسم کا انتظام کر رکھا ہے"

مسعود: "آئیے اِس بیچ کے راستے سے چلیں"

"لیکن دوسرے راستہ سے نکل گیا تو کیا ہوگا"

"ہر ایک زینہ پر دو دو آدمی چھوڑ دو"

"لیکن کل چھ تو سپاہی ساتھ ہیں۔ اس سے ہماری قوت منقسم ہو جائیگی۔ معلوم نہیں کیا ضرورت پیش آئے!! یہ مناسب ہوگا کہ ایک آدمی بیچ کے زینہ سے اوّل اوپر چڑھے اور راستہ دیکھ آئے"

مسعود: "آپ اجازت دیں تو مَیں آگے جاؤں"

"بہت اچھا بسم اللہ کہیے اور اوپر جائیے اور راستہ دیکھ آئیے۔ لیکن بہت ہوشیاری سے جانا، کوئی خطرہ ہو تو فوراً لوٹ آنا اور آواز دینا۔ مَیں یہاں تمھاری واپسی کا انتظار کروں گا اور دیکھتا رہوں گا کہ بہرام یا اُسکا کوئی چیلہ اس راستہ سے نہ بھاگ نکلے"

مسعود تیزی سے بیچ کے زینہ پر چڑھا، پچیسویں سیڑھی کے سامنے ایک معمولی دروازہ تھا۔ ہاتھ لگاتے ہی کھل گیا۔ اندر سے بند نہ تھا۔ اندر پہونچا بڑا کمرہ تھا لیکن چھت نیچی، کمرے میں ہر طرف بڑے بڑے صندوقوں، الماریوں، اور میز کرسیوں کا انبار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی سوداگر کا گودام ہے۔ یہاں سے دروازے

نیچے جانے کے لیے اور نظر آئے۔ یہ وہی دروازے تھے جن کی حفاظت کے لیے شب سنگھ نیچے ٹھہر گیا تھا۔ ارادہ کیا کہ شب سنگھ کو بلائے، مگر سامنے اوپر چڑھنے کے لیے ایک اور زینہ نظر آیا۔ مسعود آگے بڑھا اور پہلے کی طرح پچیسویں سیڑھی پر دروازہ ملا۔ کھولا تو پہلے کمرہ کی طرح یہاں بھی قسم قسم کے سامان کا انبار پایا۔ یہ کمرہ نیچے کے کمرے سے کسی قدر چھوٹا تھا۔

ایک اور زینہ ملا۔ اور تیسرا کمرہ، اب مسعود کی سمجھ میں آیا کہ گنجائش کم ہونے کی وجہ سے تلے اوپر کمرے بنائے گئے ہیں۔

چوتھے کمرے میں پہونچکر مسعود نے کھڑکی سے نیچے کی طرف نظر کی تو دریا کا پانی چالیس پچاس فٹ نیچے نظر آیا۔ اب مسعود نے ارادہ کیا کہ شب سنگھ کو لے آئے ہر طرف خاموشی پر خیال کر کے مسعود سمجھا کہ چھتری بالکل خالی ہے۔ پھر ارادہ کیا کہ ایک منزل اور طے کی جائے۔ اس کے بعد شب سنگھ کو بلایا جائے۔

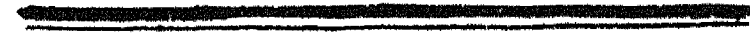
۲۵ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک اور دروازہ ملا۔ مگر یہ بالکل نئی وضع کا سبک اور خوبصورت دروازہ تھا۔ آہستہ سے کھولا۔ کمرہ میں کوئی نہ تھا، مگر مسعود محوِ حیرت ہوگیا۔ یہ کمرہ دوسرے کمروں سے بالکل مختلف تھا۔ بے ترتیب صندوق اور فرنیچر کے بجائے یہاں پرتکلف لیس کے پردے نفیس تصویریں، قیمتی سامان نظر آیا۔ ایک طرف دو بڑے بڑے سائیڈ بورڈوں پر سونے چاندی اور کٹ گلاس کے ظروف دیکھے۔ بیچ میں ایک میز پر کھانے کا سامان، فواکہات، شربت اور شرابوں کی بوتلیں، تازہ پھولوں کے گلدان نظر آئے۔ تین چار کھڑکیوں سے کافی روشنی اور ہوا کمرہ میں آتی تھی۔

کھانے کی میز پر تین آدمیوں کے لیے چھری کانٹے اور برتن لگے ہوئے تھے۔ مسعود کھانے کی میز کے قریب آیا۔ تینوں جگہ ایک ایک کارڈ، جڑاؤ پن سے نیپکن پر آویزاں تھا، اُور قریب گیا اور پڑھا۔

"بہرام"

اُس کے مقابل میں "مسز بہرام" کا کارڈ تھا، پھر تیسرے کارڈ پر نظر ڈالی اور سخت متحیر ہوا۔ یہ خود اُس کے نام کا کارڈ تھا!

"مسٹر مسعود حسن"



باب ۲۰

شاہانِ دہلی کا خزانہ

ایک پردہ ہٹا اور بہرام ہنستا ہوا برآمد ہوا۔

"خوش آمدید مسٹر مسعود! مزاج تو اچھا ہے؟ آپ کسی قدر دیر میں آئے! میں نے بارہ بجے کا وقت کھانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ لیکن کچھ مضائقہ نہیں بارہ بج کے چند منٹ گذرے ہیں، آئیے بیٹھیے، لیکن خیر تو ہے! حیرت زدہ کیوں ہو کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟"

جب سے بہرام کا مقابلہ شروع کیا مسعود کو طرح طرح کے حادثات اور تعجب انگیز واقعات سے سابقہ پڑا، اور وہ آج بھی دریائے حیرت میں غوطہ لگانے کے لیے تیار تھا لیکن جس انوکھی شکل میں حیرت سے آج سابقہ پڑا اُس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

مسعود ششدر ہو کے رہ گیا۔ بجائے بہرام کے اپنے پُرانے رفیق چمپت رائے کو سامنے کھڑا پایا! مسعود آج بہرام کی گرفتاری کے لیے چلا تھا۔ لیکن اسوقت اُسے معلوم ہوا کہ بہرام اور چمپت رائے دو شخص نہیں ہیں۔ کون چمپت رائے؟ وہی جسے مسعود اپنا رفیق سمجھ کر نیلی چھتری کے حملہ میں اپنے ساتھ لے گیا تھا! وہی! چمپت رائے جو چتر گڈھی کا مالک تھا اور جسکی مدد سے اُس کے والد اور فیروزہ بائی نے قید سے رہائی پائی تھی! مسعود پر خوف طاری ہو گیا اور رُک رُک کر بولا۔

"تم! تم کیا ہو؟"

بہرام (بآواز بلند) "اسمیں تعجب کی کیا بات ہی؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہماری مولوی یا پروفیسر سعید کے علاوہ میں کوئی اور بھیس نہیں بدل سکتا! مسٹر مسعود ذرا غور کرو تو سمجھو گے کہ جو درجہ بہرام کو اس وقت ملک میں حاصل ہے اس کے لحاظ سے اُسے ہت نیا روپ بدلنا پڑتا ہے۔ آج مولوی بن کے حضرت شاہ سلیمان صاحب سے بھی زیادہ مؤثر لہجے میں دہلی کی جامع مسجد میں وعظ کہتا ہی، کل پروفیسر بن کر ہسٹورکل سوسائٹی کے سالانہ جلسہ میں لکچر دیتا ہی، کبھی بیرسٹر اور وکیل بن کے اپنے دوستوں کو قانون کے جال سے نکالتا ہی کبھی کونسل کا ممبر بن کے انتظام ریلوے پر نکتہ چینی کرتا ہی کبھی پولیس افسر بن کے سنگین مقدمات کی تفتیش کرتا ہی۔ بہرام میں یہ قابلیت نہ ہوتی تو آج معمولی چور اُچکّوں کی طرح کسی جیلخانہ میں چکی پیستا ہوتا۔ لیکن آج اصلی شکل وشباہت میں تمھارے سامنے موجود ہی۔ خوب غور سے دیکھ لو اور پھر غلطی نہ کرنا۔"

"اگر تم واقعی چمپت رائے ہو تو۔ فیروزہ ؟"

"ایک لمحہ انتظار کرو،"

یہ کہکر پیچھے سے پردہ اُٹھایا اور گردن سے اشارہ کیا۔ فیروزہ بائی اپنی پُر سحر آنکھوں، کالے بالوں، عالمتاب چہرہ کی کل دولت لیے، پردہ سے برآمد ہوئی اور جھک کے مسعود کو سلام کیا ؟"

مسعود: "آہ! فیروزہ بائی، واقعی آپ ہیں ؟

بہرام: "مسعود۔ اب ان کا یہ نام نہیں ہی بلکہ مسز چمپت رائے کہنا چاہیے تم جانتے ہو ان کی شادی میرے ساتھ، حسب رواج برھمو سماج باضابطہ ہوئی ہے۔ اور یہ میری منکوحہ بیوی اور میرے دل کی مالک ہیں۔ یہ سب تمھاری عنایت ہی کی،

بدولت حاصل ہوا، جس کا میں بہت شکر گزار ہوں، لاؤ ہاتھ بڑھاؤ، شکوہ شکایت باقی ہو تو اس کا یہ موقع نہیں ہے۔"

مسعود کو اس وقت بہرام کی برتری کا پورا احساس تھا اور اس غیر متوقع حالت میں سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ دیکھا کہ بہرام کے سامنے اپنی کمزوری کا اقرار کرے۔ اتنے میں ایک خدمتگار نے کھانا میز پر چن دیا۔

"مسٹر مسعود! معاف کرنا۔ دل تو چاہتا تھا کہ آپ کو شاہان دہلی کے مرتبہ کے لحاظ سے پُر تکلف دعوت دیتا مگر اتفاق سے میرا کاب دار رخصت پر ہے جو کچھ موجود ہے پیش کرتا ہوں۔ مسز بہرام کو پہلے سے آپ کے آنے کی اطلاع نہ تھی ورنہ اس سے بہتر کھانا مل سکتا۔"

مسعود بھوکا تھا کرسی آگے بڑھا کھانا شروع کر دیا۔ وہ بہرام کی اس جدت اور اطمینان پر متعجب تھا اور خیال کرتا تھا کہ شاید بہرام کو اس کا احساس نہیں ہے کہ دشمن اُس کی گرفتاری کے لیے نیچے کھڑا ہے اور اب وہ چاروں طرف سے گھر گیا ہے۔

"مسٹر مسعود ہم دونوں آپ کے بڑے احسانمند ہیں۔ آپ کی امداد شامل حال نہ ہوتی تو فیروزہ بائی کے ساتھ اس آسانی سے شادی نہ ہو جاتی! تمھارا خیال بالکل صحیح تھا، میں پہلی ہی نگاہ میں فیروزہ بائی پر ہزار جان سے مفتوں و شیدا ہو گیا تھا۔ اور اگر سچ پوچھو تو پیاری فیروزہ! شرماؤ نہیں، میری تپش محبت نے فیروزہ کے دل کو شروع ہی سے نرم کر دیا تھا۔ پھر میری تیمارداری کر کے فیروزہ بائی نے مجھے از سر نو زندہ کیا۔ ان کی مسیحائی نہ ہوتی تو میں جانبر نہ ہوتا۔ لیکن مجھے یہ کب گوارا تھا کہ فیروزہ جیسی شریف اور عفت مآب لڑکی ایک چور اُچکے کے ساتھ پوشیدہ طور پر عقد کرکے

اپنی اور اپنے خاندان کی خودداری کو صدمہ پہونچائے اس لیے مجھے اپنی اصلی ہیئت گدائی کو اختیار کرنا پڑا۔ چمپت رائے یعنی اپنے لڑکپن کا نام اختیار کرکے میں نے تمھاری ضدی طبیعت سے فائدہ اُٹھایا۔ جب تم نے نیلی چھتری کی تلاش کو نہ چھوڑا تو میں نے تمھارے والد کو نیلی چھتری میں لاکے رکھ دیا۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم نے میری حماقت اور سادہ لوحی سے فائدہ اُٹھایا۔"

"واہ! دوسرا ہوتا تو وہ بھی اس دھوکہ میں آجاتا۔"

"تو کیا تم فیروزہ بائی سے شادی کرنے میں میری وجہ سے کامیاب ہوے؟"

"بیشک، چمپت رائے پر بہرام ہونے کا کون شک کرسکتا تھا۔ کون چمپت رائے؟ مسعود کا دوست، جس کی مدد سے تم نے اپنے والد اور فیروزہ بائی کو بدمعاش بہرام کی قید سے رہا کیا! جس چمپت رائے نے بہرام کے پنجہ سے اُس کی محبوبہ کو نکالا ہو اُس پر کون شک کرسکتا ہے۔ کیوں مسعود! وہ رات کس قدر پرلطف تھی جب ہم اور تم نیلی چھتری میں داخل ہوئے۔ تم پر غشی کا طاری ہونا۔ میرا سنتری پر حملہ کرنا۔ تمھارے والد اور فیروزہ بائی کی رہائی! میرے عشقیہ خطوط اور گلدستوں کا انبار ملنا! پھر نسبت کے بعد مجھے، بہرام یعنی خود اپنے حملہ سے محفوظ رکھنے کی تدابیر اختیار کرنا، دھوم کے ساتھ شادی کا ہونا رات کو پُرتکلف دعوت! پروفیسر سعید کا خط اخبار میں پڑھا جانا اور تمھارا غش کھاکے گر پڑنا! کیوں مسعود! ان واقعات کی یاد کس قدر دل خوش کن اور دلچسپ ہے!"

بہرام سرگرمی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ فیروزہ بائی بڑی محبت بھری نظروں سے بہرام کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ اُس کے چہرہ پر قدرے تردد کے آثار پائے جاتے تھے۔ بہرام نے اُس کی طرف رُخ کیا اور فیروزہ مسکرانے لگی

"کیوں مسعود! تمھاری کیا رائے ہے میں نے اپنا گھر عمدگی سے آراستہ کیا ہے یا نہیں۔ اس میں ایک خاص جدت ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کشادہ اور آرام دہ ہے تاہم بعض لوگ اسے اپنی ضروریات کے لیے بالکل کافی سمجھتے تھے اور وہ بھی معمولی لوگ نہیں بلکہ وہ دیکھو سامنے دیوار پر اُن کے نام کندہ ہیں۔"

مسعود نے گھوم کے دیکھا تو مفصلہ ذیل نام پائے۔

راجہ یدھشٹر بکرماجیت سمندر پال جوگی شیر سنگھ رائے پتھورا قطب الدین

محمد تغلق امیر تیمور اکبر شاہجہاں محمد شاہ شاہ عالم بہرام

"معلوم نہیں میرے بعد کس کا نام دیوار پر ثبت کیا جائے گا۔ افسوس یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یدھشٹر سے بہرام تک سلسلہ قایم رہا اب جانے ہے۔ اب دوسرا زمانہ آیا۔ لوگ کونسل میں سوال کریں گے کہ دوسرے عجائبات کی طرح نیلی چھتری بھی پبلک کے لیے وقف کر دی جائے۔ ہر کس و ناکس یہاں آئے گا اور اپنی عامیانہ نگاہیں ان عجائبات پر ڈالے گا خیال تو کرو بہرام کی کوشش شامل حال نہ ہوتی تو نیلی چھتری عوام کی نگاہ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ رہتی مسعود کچھ نہ پوچھو جس دن اول مرتبہ اس متبرک مقام پر میں نے قدم رکھا، میں خوشی کے مارے پھولے نہ سماتا تھا۔ [illegible] ثابت کرنا اور نیلی چھتری پر واقف ہونا معمولی واقعہ نہ تھا شاہان دہلی کے پوشیدہ خزانہ کا مالک ہونا ان کی بیش قدر جواہرات کو پوشیدہ خزانہ میں سما لینا اور اہل دنیا سے مامون و محفوظ رکھنا معمولی بات نہ تھی!

سفر ہمارے نہایت عمدہ نتیجہ پر ہوا مگر ختم ہو گیا ہے۔

"دیکھو پیچھے [illegible]

بہرام "کچھ نہیں، دریا کی لہریں چھتری سے ٹکرا رہی ہیں۔"

"نہیں یہ لہروں کی آواز نہیں ہے۔ میں اُسے خوب جانتی ہوں یہ آواز اَور قسم کی ہے!"

بہرام "مُسکرا کر تو پھر پیاری فیروزہ تمھارے نزدیک کیا شے ہے۔ میں نے سوائے مسعود کے اور کسی کو کھانے پر نہیں بُلایا تھا۔" پھر خادم کی طرف رخ کر کے۔

"کیوں منگلو! تم نے نیچے کے سب دروازے بند کر دیے تھے یا نہیں؟"

"جی حضور سب دروازے بند کر کے چٹخنیاں چڑھا دی تھیں۔"

بہرام اُٹھا اور اپنی بیوی سے کہنے لگا "آخر کیا ماجرا ہے؟ آؤ یہاں آؤ۔ پیلی کیوں پڑتی جاتی ہو؟"

اُس نے چند باتیں آہستہ آہستہ فیروزہ بائی کے کان میں کہیں، کچھ ملازم سے کہا اور پردہ ہٹا کے دونوں کو اُس کے پیچھے کر دیا۔ نیچے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں مسعود نے خیال کیا "شب سنگھ زیادہ انتظار نہ کر سکا اور اب دروازے توڑ رہا ہے"، بہرام نے سلسلۂ کلام پھر شروع کیا اور نہایت اطمینان سے، گویا کہ سُنا ہی نہیں، کہنے لگا۔

"خدا کی پناہ! جب میں نے نیلی چھتری کو دریافت کیا اُس کی بُری حالت ہو رہی تھی محمد شاہ رنگیلے کے بعد اس میں کوئی بادشاہ نہیں رہا۔ خود اُسکے جانشین عیش و عشرت میں ایسے مشغول رہے کہ کبھی ادھر کا رُخ نہ کیا۔ کسی میں عقل ہوتی اور اس خزانہ سے فائدہ اُٹھاتے تو بادشاہت یوں کوڑیوں کے مُول نہ بک جاتی۔ سُرنگ گرنے والی تھی زینے بے مرمت اور خطرناک حالت میں تھے، دریا کا پانی رس رس کے نیچے

کے حصے میں بھر گیا تھا۔ میں نے قبضہ کرتے ہی چھتری کو از سر نو درست و آراستہ کیا۔ بلکہ ایک لحاظ سے بالکل نیا جنم دیا۔"

مسعود: "جب آپ یہاں آئے تو کیا چھتری خالی تھی؟"

"تقریباً خالی۔ شاہان دہلی میری طرح اسے بطور گودام اور توشک خانہ کے استعمال نہیں کرتے تھے ..."

"بطور پناہ گاہ کے؟"

"ہاں یہ سچ ہے۔ نازک وقت میں پناہ کا اور کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا تھا تو یہاں آجاتے تھے۔ لیکن اس چھتری کو دراصل شاہان دہلی کا بنک سمجھنا چاہیئے جب اشد ضرورت ہوتی یہاں سے خزانہ نکال لیتے تھے۔ امن کے وقت زائد روپیہ اور جواہرات اس میں جمع کرتے تھے۔"

"دھماکوں کی آواز اب زیادہ زور کے ساتھ آنے لگی، غالباً شب سنگھ نے پہلا دروازہ توڑ لیا تھا اور اب دوسرے پر چوٹیں لگا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد آوازیں زیادہ قریب اور زیادہ زور کے ساتھ آنے لگیں۔ اب تیسرے دروازہ کی باری تھی۔ صرف دو باقی رہ گئے تھے۔ کھڑکی سے مسعود نے نگاہ کی، کچھ فاصلہ پر متعدد کشتیاں گشت لگا رہی تھیں دریا پار ٹیکری پر توپخانہ اور سپاہی دکھائی دیے۔

بہرام (زور سے) "اُف! کس قدر شور و غل ہے! کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ یہاں باتیں کرنا مشکل ہے! چلو دوسری منزل پر چلیں۔ وہاں کا سامان بھی دیکھنے کے قابل ہے۔"

دونوں آدمی اوپر کی منزل پر چڑھ گئے۔ بہرام نے دروازہ بند کر کے

چٹخنی چڑھا دی۔ پھر مسعود سے کہا۔

"یہ میرا کتب خانہ اور تصاویر کا ذخیرہ ہے"

الماریوں میں نہایت نادر قلمی نسخے قرینہ سے رکھے ہوے تھے۔ زیب النساء کا دیوان، آئینۂ اکبری کا اصل نسخہ ابو الفضل کے ہاتھ کا۔ کالی داس کی شکنتلا پرانے وضع کے کاغذ پر لکھی ہوئی۔ راجہ اشوک کے فرمان۔ شیخ سعدی شیرازی کے قلم کی گلستاں۔ غرضکہ کوئی نادر کتاب ایسی نہ تھی جو یہاں نہ ہو۔

مسعود (خوشی کے لہجہ میں) "واقعی کیا عمدہ نسخے ہیں۔ نہایت عجیب نقل ہے"

"نقل کی بھی ایک ہی رہی! ہوش کی دوا کرو۔ نقل ہوگی برٹش میوزیم میں، برلن اور لیڈن کی لائبریری میں، پٹنہ اور بنارس میں! یہ اصل نسخے ہیں! ان کی بجائے میرے شاگردوں نے ہر جگہ نقلیں رکھدی ہیں، مگر عمدہ قسم کی نقلیں۔ کسی چیز کا بدلنا چوری میں داخل نہیں ہے"

"لیکن کبھی نہ کبھی اس ستم ظریفی کا راز کھل جائے گا"

"بے شک کبھی نہ کبھی پردہ فاش ہوگا اور ہر جلد کے اخیر میں بہرام کے دستخط پائے جائیں گے۔ اُس وقت اہلِ ملک میری قدر کریں گے کہ ہندوستان اور ایشیا کی نادر کتابیں جو اہل یورپ کوڑیوں کے مول اپنے ملک کو لے گئے، سب ہندوستان میں میری بدولت واپس آگئیں؟"

"اور یہ تصویریں، کیا یہ بھی اصلی ہیں؟"

"بے شک! یہ دیکھو راوی ورما کی چاروں تصویریں جو نور محل سے حاصل کی گئیں، بیگم صاحبہ بھوپال کے ہاتھ کے کھینچے ہوے مناظر، پیرس اور برلن کے تصویر خانوں

کی مشہور تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ اس معاملہ میں میرا عمل بالکل ایسا ہی ہے جیسا نپولین کا۔ اُس نے اٹلی کی تمام قیمتی تصویریں فرانس میں جمع کر دی تھیں میں ان تصویروں کو اپنے ملک میں لے آیا۔ جب ہندوستان میں مصوری اور فنونِ ظریفہ کا رواج ہو گا تو اہل ملک میری خدمات کی قدر کریں گے۔ کیوں مسعود کیا نفیس تصویریں ہیں

ایک دروازہ اور ٹوٹا اور آواز بالکل قریب آنے

"دشب سنگھ نے کہا طوفان بے تمیزی مچا رکھا ہے۔ اطمینان سے باتیں بھی نہیں کر سکتے۔ چلو مسعود، تیسری منزل پر چلیں"

زینہ چڑھ کر ایک اور کمرہ میں داخل ہوئے۔

"مسعود! یہ میرا توشک خانہ ہے"

یہاں نہایت نفیس اور قیمتی کپڑے ہر زمانہ اور ہر ملک کے بنے ہوئے عمدگی سے آراستہ کیے گئے تھے ایک طرف شاہان دہلی کی استعمال شدہ پوشاکیں بطور یادگار قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ہر ایک پر بادشاہ کا نام مدت حکومت وغیرہ تحریر تھی۔

"مسعود غور سے دیکھو! یہ ریشمی کپڑے، کشمیر کے شال، ڈھاکہ کی ململ، بنارس کا اطلس، اہل یورپ جو اپنے کارخانہ کی چیزیں دنیا بھر میں بڑے فخر کے ساتھ بھیجتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں کبھی صنعت و حرفت کا نام نہ تھا، یہاں آئیں اور دیکھیں کیا آج تک یورپ نے اس قسم کی چیزیں بنائی ہیں! نقل البتہ کی ہے لیکن وہ بھی بھونڈی! رونا تو یہ ہے کہ خود ہندوستانی بھی اپنے ملک کی پرانی مصنوعات سے واقف نہیں ہیں لیکن یہ توشک خانہ ان خیالات کو بدل دیگا۔

دروازے توڑنے کی آوازیں جس قدر نزدیک آتی گئیں، اوپر چڑھتے گئے چوتھا اور پانچواں حصہ دیکھا گیا۔ بالآخر سب سے آخری کمرے میں پہونچے۔ یہاں بہرام نے کہا۔

"لو مسٹر مسعود! آخری منزل ہے اور شاہان دہلی کا خزانہ اسی میں ہے" بجائے چوپہلو ہونے کے یہ کمرہ گول تھا اور مخروطی شکل کا۔ دیواریں جھکتے جھکتے بیچ میں گنبد کی شکل میں مل گئی تھیں۔ گنبد میں ایک قیمتی جھاڑ آویزاں تھا فرش بجائے پتھر کے لکڑی کے ہشت پہل ٹکڑوں کا جس پر آبنوس اور ہاتھی دانت کی پچی کاری تھی۔

"مسعود سب سے پہلے اس جھاڑ پر نظر کرو۔ تم کہو گے کہ اسکے بہت سے حصے نئی وضع کے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے، یہ پرانی اور قیمتی چیز نہیں ہے مگر [illegible] لحاظ سے تاریخی شے ہے۔ تم نے سنا ہوگا کہ جب امیر کابل دہلی کی سیر کو آئے تو مسجد کو ایک جھاڑ نذر کیا تھا۔ مگر کچھ دنوں بعد وہ جھاڑ چوری گیا۔ دہلی کی مخلوق ہمیشہ سے بدگمان مشہور ہے اپنی عادت کے موافق متولیان مسجد کو اس کا مجرم قرار دیا اور بعض لوگوں نے امام صاحب تک کو مشکوک سمجھا لیکن اب ہم اس بدگمانی کو دور کر دینا۔ یہ میرے شاگردوں نے چرا کر یہاں رکھا ہے"

(ایک الماری کھول کر) "یہ دیکھو یہ ہے جواہرات اور موتیوں کا خزانہ، مہاراجہ گوالیار موتی والے مشہور ہیں اور کسی زمانہ میں واقعی انکے یہاں موتیوں کا ذخیرہ بہت نادر تھا لیکن وہاں کے بہترین موتی یہاں ہیں مہاراجہ جے پور کے یہاں کے چرائے ہوئے موتی اس ڈبہ میں ہیں۔ دیکھو کیا آب اور کیا رنگ پایا ہے۔ اب زیورات دیکھو، نورجہاں کے ہاتھ کی مشہور جہانگیر یادگار [illegible] رانی [illegible] کا چندن ہار، شاہجہاں بیگم والی بھوپال کے جڑاؤ نورتن مہارانی بڑودہ کے کان کے بندے جنھیں نکلوا کر [illegible] اور یہ [illegible] کی عمر تو [illegible] کے منہ میں

پانی بھر آیا تھا، سب یہاں ہیں۔
کچھ دن ہوئے سومنات اور متھرا اور کاشی جی کے مندروں سے بہت سے قیمتی زیورات اور مورتیاں چوری گئی تھیں، لیکن مسعود یہ دیکھو سب بحفاظت یہاں جمع ہیں۔ خوب غور سے دیکھو، جب یہ سامان اہل ملک کے قبضہ میں جائیگا تو تمکو ان سب کی تشریح کرنا ہو گی۔"

تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے نیچے بڑی سرگرمی سے دروازے توڑے جا رہے تھے، شاید دو تین دروازے باقی ہونگے۔ جمنا میں کشتیاں زیادہ سرعت کے ساتھ گرداوری کر رہی تھیں۔

مسعود نے پوچھا۔

"اور خزانہ کہاں ہے؟"

"اُف! آخر تم سے صبر نہ ہو سکا کیا تمھارے نزدیک یہ نادر اور عجائب روزگار چیزیں خزانہ کی بہ نسبت کم وقعت ہیں لیکن تم لڑکے ہو اخزانہ کا نام تمھارے کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہو۔ تم بھی عام آدمیوں کی طرح یہ سوال کرتے ہو لیکن خیر آؤ تمھیں خزانہ بھی دکھا دوں۔"

یہ کہکر اُس نے فرش کے ایک ہشت پہل حصہ پر زور سے پیر مارا۔ کمانی کے کھسکنے سے پٹ کھل گیا، بہرام نے ہاتھ ڈال کے ایک گول ظرف پیالہ کی شکل کا نکالا، لیکن اسے خالی پایا۔ تھوڑی دور پر اُس نے اسی طرح پھر پیر مارا اور دوسرا خانہ کھل گیا لیکن یہ بھی خالی تھا۔ دو تین دفعہ اس عمل کو دہرایا لیکن نتیجہ وہی ہوا۔ بہرام نے آہ سرد بھر کر کہا:-

"افسوس یہ خانے جو اورنگ زیب کے زمانہ تک اشرفیوں اور جواہرات سے لبالب تھے، اب بالکل خالی ہیں اورنگ زیب کے نالائق جانشینوں نے عیش و عشرت میں سب

برباد کر دیے۔ محمد شاہ رنگیلے کے لہو و لعب کا خیال کرو، ایک ایک چاندنی رات میں لاکھوں کا مقیش نے کے ٹکڑوں میں بھر کے پھونک سے اڑا دیا جاتا تھا۔ ایسی فضول خرچی کے سامنے شاہانِ دہلی کا خزانہ بھی پناہ مانگ گیا۔ جو کچھ باقی تھا نادر شاہ کی دہلی وزی میں کام آیا۔ بابر، اکبر، شاہجہاں اور اورنگ زیب نے یہ سب خانے بھرے چھوڑے تھے، اب افسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے"

کچھ دیر خاموش رہا اور کہنے لگا۔

"لیکن مسعود ابھی ایک خانہ باقی ہے، بس یہی وقت پر کام آنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ بہادر شاہ نے اپنی زندگی کس عسرت میں بسر کی، لیکن واہ رے وضعداری اپنے آبا و اجداد کے اندوختہ جواہرات کو کبھی ہاتھ نہ لگایا"

یہ کہکر بہرام نے ایک اور خانہ کھولا، اس میں ایک صندوق نظر آیا، بہرام نے اپنی جیب سے چھوٹی سی کنجی نکالی اور صندوق کھولا۔

عجب منظر تھا۔ صندوق میں ہر قسم کے قیمتی جواہرات چمک رہے تھے ہیرے کی آب آنکھوں میں چکا چوند ڈالتی تھی، فیروزہ کی نیلاہٹ، لعل کی سُرخی، نیلم، پکھراج، پنا، غرضکہ ہر قسم کے قیمتی پتھر یہاں موجود تھے۔

"مسعود خوب دل بھر کے دیکھ لو، پھر ایسا منظر کبھی نصیب نہ ہوگا۔ دیکھو کیسے عجائب روزگار جواہرات یہاں جمع ہیں، دنیا کا کوئی حصہ نہیں جہاں کے بہترین جواہرات یہاں نہ ہوں، یہ دیکھو بدخشاں کے لعل جنھیں بابر اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ جزیرہ کے مشہور موتی جو اکبر کے نذر کئے گئے تھے، یہ دکھنی ہیرے جنھیں اورنگ زیب برسوں کی فوج کشی کے بعد دکن سے لایا تھا، کوہ نور اِن ہیروں کے سامنے ماند ہے۔

یہ دیکھو بحرین کے موتی کتنے بڑے اور کیسے سڈول ہیں، ان میں ہر ایک چیز اس قابل ہو کہ کسی ملکہ کے حُسن عالمتاب کو دوبالا کرے!"

بہرام مسعود کے سامنے کھڑا ہوگیا اور آسمان کی طرف دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"مسعود! تم دنیا پر اس کا اظہار کر دینا کہ بہرام نے اِن جواہرات میں سے کوئی شے نہیں لی ہو۔ قسمیہ کہتا ہوں کہ میں نے شاہانِ دہلی کے خزانہ کا ایک موتی تک صرف نہیں کیا ہو۔ مجھے کوئی حق نہ تھا، یہ دولت ہندوستان کی ملکیت ہو۔"

یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں نیچے شب سنگھ اپنی تمام قوت دروازے توڑنے میں صرف کر رہا تھا، اب صرف ایک دروازہ باقی رہ گیا تھا۔

"اس صندوق اور ان خالی خانوں کو کھلا چھوڑتا ہوں، یہ کہکر بہرام جلد جلد کمرے کے چاروں طرف پھرا، کبھی کسی الماری کو دیکھتا کبھی کسی تصویر پر حسرت بھری نظر ڈالتا، پھر یاس آمیز آواز میں بولا۔

"آہ! ان سب چیزوں کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنا کس قدر شاق گذرتا ہو، میری عمر کا سب سے زیادہ پُر لطف زمانہ یہاں بسر ہوا۔ اس سازوسامان کے ساتھ مجھے عشق ہو۔ ہر ایک شے میں میرے دل کا ٹکڑا رکھا ہوا ہو، لیکن افسوس میری آنکھیں اب کبھی ان چیزوں کو نہ دیکھیں گی اور میرے ہاتھ ان بیش بہا جواہرات کو کبھی نہ چھوئیں گے! افسوس!! صد افسوس!!!"

بہرام کا چہرہ حسرت و یاس کا ایسا عبرتناک منظر تھا کہ مسعود کا دل ہمدردی اور تاسف سے لبریز ہوگیا جس طرح بہرام کو غرور اپنی خودی اور اپنی عزت و [illegible] تمام آدمیوں سے کہیں زیادہ تھی، [illegible] کا اثر سب سے زیادہ تھا

کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا اور آسمان کی طرف اُنگلی سے اشارہ کر کے کہنے لگا۔

"اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس ساز و سامان کے ساتھ اِس آسمان، اور خوشنما منظر، اور دریا کی لہروں کو بھی خیرباد کہنا پڑیگا۔ قلعۂ بیگم آباد، فیروز شاہ کی لاٹ، پُرانی دہلی کے آثار جو یہاں سے نظر آتے ہیں گویا میری قوت اور برتری کی علامات ہیں۔ یہ میری سلطنت تھی اور میں یہاں کا بادشاہ! اِس چھوٹی سی سُرنگ کا خیال مت کرو۔ میں یہاں بیٹھا ہوا دنیا پر حکومت کرتا تھا۔ کُرۂ زمین میرے ہاتھ میں گیند کی طرح گھومتا تھا۔ دنیا میں جواہرات اور فنون لطیفہ کے سامان کے تمام بازار میری مٹھی میں تھے۔ مسعود ذرا اکبر اور ہمایوں کے تاج کو اُٹھاؤ یہ دیکھو ان کے نیچے ٹیلیفون کے آلات ہیں۔ ایک کا سلسلہ کلکتہ سے ملا ہے اور وہاں سے چین، جاپان، اور امریکہ تک چلا گیا ہے۔ دوسرا ٹیلیفون میرا جج کا ہے اور بمبئی سے ملا ہوا ہے۔ بمبئی میں میرا دفتر ہے اور وہاں سے لندن، پیرس، برلن، قاہرہ، قسطنطنیہ، ہر طرف خاص میرے ذاتی تار لگے ہوئے ہیں۔ ہر بڑے شہر میں میرے ایجنٹ ہیں۔ جگہ جگہ میرے دفاتر اور گودام ہیں۔ دنیا کے بازار میرے قابو میں ہیں۔ میرے چیلے اور شاگرد دنیا کے ہر حصہ میں موجود ہیں۔ میاں مسعود بعض اوقات میں اپنی قوت اور قدرت کا خیال کر کے متوالا ہو جاتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ خدا نے اشرف المخلوقات کا خطاب میرے ہی لیے تجویز کیا تھا۔

دروازہ چرایا اور دھڑ سے گرا۔ شب سنگھ اور اُس کے سپاہی ہر طرف بھاگتے اور ڈھونڈھتے پھرتے تھے۔ کچھ سکوت کے بعد بہرام نے سلسلۂ کلام پھر شروع کیا۔

"آہ! یہ سب طلسم اب ٹوٹنے والا ہے۔ موہنی صورت، کالے بالوں، پُرسحر آنکھوں کی ایک حسینہ نے میرے دل پر قبضہ کر لیا۔ اُن نرم بالوں کی دولت پر میں

دنیا کے جواہرات قربان کر رہا ہوں اور اُن پُر سحر آنکھوں کے عوض مَیں یہ ساز و سامان اور دلکش مناظر کو ہیچ سمجھتا ہوں۔ اُس محبوبہ کی خاطر اس قوت و قدرت کو خیر باد کہتا ہوں اور اس طلسم کو اپنے ہاتھ سے توڑتا ہوں۔"

شب سنگھ کے آدمی زینہ پر چڑھ کر اوپر آئے۔ دروازہ پر کوئی چیز دھڑ سے لگی۔ یہ آخری دروازہ تھا۔

بہرام نے مسعود کا ہاتھ دبا کر کہا:۔

"مسعود! جانتے ہو کہ میں نے کس لیے تمھیں کامیابی کے اس درجہ تک پہنچنے دیا اگر چاہتا تو آج سے ہفتوں پہلے کئی بار تمھاری سرگرمیوں کا خاتمہ کر چکا ہوتا۔ کیا تم جانتے ہو کہ اُس رات کو جب تم نے چند آدمیوں کو سامان سمیت نیلی چھتری سے نکلتے دیکھا میں نے اپنے دوستوں کو ان کے حصے کا مال دے کر رخصت کر دیا تھا تم ضرور سمجھتے ہو! نیلی چھتری میری کامیابی کا راز ہے۔ جب تک نیلی چھتری میرے قبضہ میں ہے مَیں ہر چیز پر قدرت رکھتا ہوں۔ جس وقت نیلی چھتری میرے ہاتھ سے نکل گئی سمجھ لو کہ بہرام اور اُس کی گذشتہ زندگی میں لوہے کی دیوار حائل ہوگئی اسکے بعد بہرام کا مستقبل شروع ہوگا۔ کیسا مستقبل؟ جس میں آرام اور اطمینان حاصل ہوگا اور دوسرے انسانوں کی طرح میں بھی شریفانہ زندگی بسر کروں گا۔ فیروزہ بائی کی آنکھیں چراغ ہدایت کا کام دینگی اور میں اپنی زندگی عبادت حق اور اپنی محبوبہ کی دلجوئی ....."

یکایک دروازہ کی طرف دیکھ کر چلایا۔

"شب سنگھ تم باز نہ آؤ گے؟ اس کھٹ پٹ کو بند کرو۔ میں نے ابھی اپنی

تقریر ختم نہیں کی ہے۔"

دروازہ پر چوٹیں زور سے پڑنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ لکڑی کا لٹھا کواڑوں پر مارا جا رہا تھا۔

مسعود حیران تھا کہ دیکھیے بہرام اب کیا چال چلتا ہے کیا کرتا ہے نیلی چھتری کو حوالہ کر دینا کوئی بات نہ تھی، کیا بہرام کو اپنی گرفتاری کی پروانہ تھی جو اس اطمینان سے ماضی و مستقبل پر تقریر کر رہا ہے۔ کیا اُسے شب سنگھ کے چنگل سے بھاگنے کی اب بھی کوئی امید ہے؟ بظاہر نکاس کا راستہ کوئی نہ تھا۔ مسعود حیران تھا کہ فیروزہ بائی کہاں غائب ہو گئی؟ اور اسکی طرح بہرام بھی کیوں نہ چلا گیا؟ بہرام اپنے خیال میں مست، آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"بہرام بھلا آدمی ہے، شریف زادہ ہے، شریفوں کی سی زندگی بسر کرے گا چوری اور قزاقی ہمیشہ کے لیے رخصت۔ لیکن کمبخت شب سنگھ سنتا نہیں ہے۔ کیوں شور مچا رکھا ہے؟ کیا تو نہیں جانتا کہ بہرام کے منھ سے ایسے الفاظ نکل رہے ہیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ یہ تاریخی الفاظ مسعود کے ذریعہ سے اہل دنیا تک پہونچیں گے اور آیندہ نسلیں اُنھیں تعجب انگیز مسرت کے ساتھ پڑھا کرینگی!"

پھر زور سے قہقہہ لگایا۔

"لیکن شب سنگھ گدھا ہے۔ اُسے اِن تاریخی الفاظ کی کیا قدر، بندر کو ادرک کی لذت کی کیا خبر۔"

جیب سے ایک نیلی پنسل نکالی اور دیوار پر موٹے حروف میں یہ عبارت تحریر کی:۔

"بہرام نیلی چھتری کا تمام خزانہ، اپنے اہل ملک کے نذر کرتا ہے اس شرط پر کہ اس کا کوئی حصہ بغیر اشد ضرورت کے صرف نہ کیا جائے اور فنون لطیفہ کے تمام

چیزوں کو دہلی کے عجائب خانہ میں علیحدہ عمارت میں رکھا جائے اور اس عمارت کا نام بہرام منزل قرار پائے۔"

"اب مجھے اطمینان ہوا۔ میرا اور ہندوستان کا حساب بیباق ہوا۔"

پولیس والے تمام قوت دروازہ توڑنے میں صرف کر رہے تھے بالآخر ایک پٹ میں سوراخ ہو گیا۔ شب سنگھ نے ہاتھ ڈال کے چٹخنی کھولنا چاہی۔

"غضب! شب سنگھ نے تمام عمر میں آج یہ کام کیا ہے۔"

بہرام نے لپک کے نیچے کی چٹخنی چڑھا دی اور قفل لگا دیا۔

"شب سنگھ ابھی اور کوشش کرو۔ دروازہ مضبوط ہے آسانی سے نہ ٹوٹیگا ابھی میرے پاس کافی وقت ہے مسعود خدا حافظ! میں تمہارا شکر گذار ہوں۔ اگر تم چاہتے تو شب سنگھ کو بہت کچھ مدد دے سکتے تھے لیکن تم اس قدر سمجھ دار اور اچھے لڑکے ہو خدا حافظ۔"

سامنے دیوار کے کنارے ایک تپائی پر گوتم بدھ کا ایک مجسمہ رکھا تھا۔ بہرام مجسمہ کی طرف بڑھا اور کمانی دبائی جس سے دیوار میں ایک دروازہ نمودار ہوا۔

بہرام "لیجیے کنور صاحب اب ہم جاتے ہیں۔ آج کی کارگزاری پر آپ کو رائے بہادری ضرور ہی مل جائے گی۔ جس وقت لاٹ صاحب رائے بہادری کا تمغہ آپ کے گلے میں ڈالیں تو بہرام کو نہ بھول جائیے گا۔"

پستول کا فیر ہوا اور بہرام جست مار کر پیچھے ہٹ گیا

"کیوں بدمعاش! معلوم ہوتا ہے ان دن کے لئے چاند ماری کی مشق کی تھی گولی سینہ پر پڑی ہے اور غریب گوتم بدھ پاش پاش ہو کے زمین پر گر پڑا ہے۔ گوتم مہاراج کا

مجسمہ درمیان میں نہ ہوتا تو آج بہرام کا کام تمام تھا!"

شب سنگھ: "بہرام اس بکواس سے کچھ فائدہ نہیں۔ اب تم کُتے کی موت مارے جاؤ گے۔ خیریت اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو حوالہ کر دو۔"

"ہوش کی دوا کرو، کہیں شیر اپنے آپ کو خوشی سے گیدڑوں کے حوالہ کیا کرتا ہے۔"

"خیر یوں ہی سہی۔ تم اپنی جگہ سے ہٹے اور خاتمہ ہوا۔"

"میں اس وقت تمہاری زد سے علیحدہ ہوں۔"

دراصل بہرام یہاں سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا تھا۔ شب سنگھ اسے سامنے فیر کر سکتا تھا لیکن اس جگہ بہرام اسکی دسترس سے علیحدہ تھا۔ اس وقت بہرام کی حالت نہایت نازک تھی، کیونکہ بدقسمتی سے پیچھے دروازہ کے سوائے اور کوئی نکاس کا راستہ نہ تھا۔ اس دروازہ کے بالکل سامنے شب سنگھ پستول لیے کھڑا تھا اور اُسکے پستول میں ابھی پانچ گولیاں اور باقی تھیں۔

بہرام نے قہقہہ لگا کر کہا "واہ میاں بہرام! آج بے طرح پھنسے۔ مذاق حد سے بڑھ گیا تمہاری چرب زبانی آج تمہیں لے ڈوبے گی!"

دروازہ کا ایک اور حصہ ٹوٹ گیا اور شب سنگھ اپنا ہاتھ آسانی سے ڈال سکتا تھا۔

بہرام فوراً ایک الماری کی آڑ میں زمین پر لیٹ گیا۔ اب آپس میں دونوں کے درمیان صرف تین قدم کا فاصلہ تھا مگر الماری درمیان میں حائل تھی۔

شب سنگھ کے غصہ کی کوئی حد نہ تھی۔ یہ دیکھ کر نہایت کرخت لہجہ میں چلّا اٹھا

"تم دیکھ کیا رہے ہو، فیر کیوں نہیں کرتے؟"

اب تک مسعود خاموش کھڑا یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا، بہرام اُس کے قابو میں تھا، اگر چاہتا تو دم بھر میں اُس کا خاتمہ کر دیتا۔ لیکن اس وقت تک مسعود کو اس لڑائی میں شریک ہونے کا خیال بھی نہ تھا۔ کوئی غیر محسوس قوت اُسے روکے ہوئے تھی۔

دھماکے کے ساتھ دروازہ اوپر سے نیچے تک ہلا اور شب سنگھ چلایا۔

"مسعود! اب کیا دیر ہے۔ بدمعاش کا خاتمہ کر دو۔"

مسعود خواب خرگوش سے چونکا اور یہ سوچ کے کہ بہرام مجرم ہے اس کی گرفتاری کا قانوناً اور اخلاقاً دونوں طرح پر حق حاصل ہے۔ اُس نے جیب سے اپنا پستول نکالا اور بہرام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

کنبھی دبانے بھی نہ پایا تھا کہ یکایک اپنے آپ کو زمین پر پایا۔ بہرام نے الماری کی آڑ سے جست لگائی، دروازہ کے سامنے جہاں شب سنگھ پستول لیے کھڑا تھا نیچے جھکا اور مسعود کو چت گرا دیا اور ذرا سے اشارہ میں مسعود کو تنکے کی طرح ہاتھ میں اُٹھا لیا۔

مسعود کو بطور ڈھال کے سامنے کیا اور شب سنگھ کے سامنے ہو کر جو دروازہ تک چلا گیا۔

"شب سنگھ! دیکھا! بہرام آخر دم تک ہاری نہ مانے گا۔ جب تک زندہ ہے اُس کی تدبیر کا ترکش کبھی خالی نہ ہوگا۔"

دروازہ بند کیا اور مسعود کو آگے ڈھکیلتا ہوا ایک زینہ پر چڑھنے لگا۔

"مسعود۔ جلد جلد قدم اُٹھاؤ۔ وقت کم ہے۔ اندرونی فوج اب پیچھے آ رہی ہے آؤ اب تمہیں بیرونی فوج، توپخانہ اور کشتیوں کے حملہ کا لطف دکھاؤں۔ سنتے ہو!...

شب سنگھ گوتم بدھ کا مجسمہ توڑ رہا ہے۔ چلو آگے بڑھو!"

چکر دار زینہ تھا، چڑھتے چڑھتے مسعود کی ٹانگیں دکھنے لگیں۔ اُسے خوف تھا کہ کہیں بہرام نیلی چھتری کی چوٹی پر پہونچ کر دریا میں نہ پھینک دے۔ لیکن بہرام مجسم زندہ دلی تھا۔ اس وقت بھی اپنی خوش طبعی اور نکتہ سنجی سے باز نہ آتا تھا۔

"دیکھا میاں مسعود! اس کھڑکی سے نیچے نظر کرو۔ کشتیاں نیلی چھتری کے چاروں طرف گھوم رہی ہیں۔ شب سنگھ نے انھیں متنبہ کر دیا ہے۔ وہ دیکھو گن بوٹ کا افسر سپاہیوں کو مشین گن تیار کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ اُدھر ٹیکری پر شب سنگھ کا توپخانہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ گولہ انداز ہر طرف دوڑ رہے ہیں۔ کیا تماشہ ہے، ایک بہرام کی جان کے لیے اس قدر بحری اور بری قوتیں جمع ہیں!"

سامنے لالٹین دکھائی دی اور فیروزہ بانو گھبرائی ہوئی آگے بڑھی "تم کیا کر رہے تھے۔ اتنی دیر! میرے حواس پراگندہ تھے، شکر ہے تم آگئے۔ اب چلو دیر نہ کرو۔ لیکن تم تنہا نہیں ہو!"

"پیاری فیروزہ پریشان نہ ہو۔ یہ ہمارا پرانا دوست مسعود ہے۔ مسعود نے آج بڑی دوراندیشی اور عنایت سے کام لیا۔ لیکن یہ قصہ پھر سناؤں گا۔ اب وقت بالکل نہیں ہے اور دشمن پیچھے ہے۔ . ."

"کیوں ہرانی سب سامان تیار ہے؟"

ہرانی: "جی ہاں"

اس وقت یہ لوگ نیلی چھتری کے قریب تھے۔ بہرام نے ایک بٹن پر ہاتھ رکھا اور برقی روشنی ہو گئی۔ ان کے سامنے شیشہ کا ایک جسیم کرہ تھا جس میں قدِ آدم

کشش سے زیادہ ہے لیکن اگر کسی ترکیب سے زمین کی کشش کو بے اثر کر دیا جائے تو نتیجہ کیا ہوگا؟"

"تو اُس وقت بیشک چاند کی کشش اپنا اثر کرے گی لیکن زمین کی کشش کو زائل کرنا ممکنات سے ہی ایسا ہو نہیں سکتا۔ قانونِ قدرت بدل نہیں سکتا ہر ایک وزنی شے مرکز ثقل کی طرف کھنچے گی۔"

"تم بالکل صحیح کہتے ہو، لیکن جیسا مرکز ثقل زمین میں ہے چاند میں بھی ہے ناممکن کوئی چیز نہیں۔ وہ بھی بہرام کے لیے یہ میری تازہ ایجاد ہے اور مجھے اس پر بڑا ناز ہے میں نے برسوں کی محنت میں یہ نتیجہ حاصل کیا ہے اس شیشے کے گولے پر جو سیاہ غلاف تم دیکھتے ہو، ساری کرامات اسی میں ہے۔ جب یہ کسی چیز کو ہر طرف سے ڈھانک لیتا ہے اور ایک خاص درجہ کی حرارت پاتا ہے وہ اُس چیز کو زمین کی کشش سے آزاد کر دیتا ہے۔ اور ایک لخت چاند کی کشش کے اثر سے چاند کی طرف گولی کی رفتار سے لے جاتا ہے۔"

"لیکن نیچے اُترنے کا کیا ذریعہ ہے۔"

"بالکل آسان۔ یہ دیکھو اس بٹن کے دبانے سے کُرہ کے نیچے ایک کھڑکی کھلتی ہے، جس سے سیاہ غلاف علیٰحدہ ہو جاتا ہے۔ زمین کی کشش فوراً اثر کرنے لگتی ہے اور ہم پھر نیچے اُترنے لگتے ہیں (بٹن کو دبا کر) دیکھو اتنی ہی دیر میں ہم کس قدر نیچے اُتر آئے۔ جب زمین کے متوازی بلند سا ہوتا ہوں سامنے کی کھڑکی کھول دیتا ہوں (دوسرا بٹن دبا کر) یہ دیکھو ہم ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اوپر یا نیچے نہیں بلکہ سامنے جا رہے ہیں۔ رفتار کے گھٹانے یا بڑھانے کو

متعدد کھڑکیاں بنی ہیں۔ جس قدر زیادہ کھڑکیاں ایک ساتھ کھولی جائینگی اُسی قدر اُس سمت کی کشش کا زیادہ اثر ہوگا۔"

نیچے کی ایک اور کھڑکی کھول کر "اب دیکھو ہم شہر دہلی کے کس قدر نزدیک ہو گئے۔ چاندنی چوک، گھنٹہ گھر، جامع مسجد، قلعہ، سب صاف نظر آرہا ہے۔"

مسعود حیرتِ مجسم بنا ہوا تھا اور بہرام کی عظمت سے اس قدر مرعوب تھا کہ اُسے جن اور فرشتہ کے مرتبہ پر سمجھنے لگا۔

"میاں مسعود! اب تم سمجھے کہ نیلی چھتری کے خزانہ اور کمین گاہ کو میں نے دیدہ و دانستہ اپنے اہلِ ملک کے کیوں نذر کردیا؟ میری حب الوطنی کسی ہندوستانی سے کم نہیں۔ اس جنگ کے زمانہ میں میں نے اپنے ملک اور بادشاہ کی بہترین خدمت اسی میں سمجھی کہ شاہان دہلی کا خزانہ نذر کردوں۔ لیکن یہ عجیب ایجاد جسکا نام میں نے ردِ ثقل (   ) یعنی کشش کا زائل کرنے والا مصالحہ رکھا ہے شاہانِ دہلی کے خزانہ سے کہیں زیادہ بیش بہا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ ردِ ثقل کی مدد سے میں آسمان و زمین پر کس طرح قادر ہوگیا ہوں دنیا کی کوئی قوت میرا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اب تک جتنے ہوائی جہاز بنے ہیں سو سوا سو میل کی رفتار سے زیادہ نہیں چلتے اور وہ بھی بجلی اور تیل کی قوت کے محتاج ہیں۔ انجن کا ایک پرزہ بگڑا، یا بجلی کا ایک تار خراب ہوا اور تمام شین اور سوار یا اسفل السافلین تحت الثری کو پہونچیں۔ برخلاف اس کے، ردِ ثقل سب باتوں سے مستغنی ہے۔ ہوائی جہازوں نے اب تک کیا ہی کیا ہے؟ ایک قوم نے دوسری قوم کے آدمیوں کو ہلاک کیا۔ بچوں اور عورتوں کو بم پھینک کر قتل کیا۔ اس

خوبصورت عمارتوں کو مسمار کیا لیکن ردّ ثقل ہرگز قتل و غارت گری کے کام میں نہیں لایا جائے گا۔ اس سے دنیا کے آرام و آسائش میں اضافہ ہوگا۔ فرض کرو کہ میں بار برداری میں اسے استعمال کروں، میری گاڑیاں بلا کوئلے اور انجن اور برقی قوت کے چلیں گی۔ دنیا میں کوئی کمپنی میرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ موجودہ ریلوے کمپنیاں جو کروڑوں روپیہ انجنوں اور کوئلے پر صرف کر دیتی ہیں اور آہنی پٹری کی محتاج ہیں، سب بند ہو جائیں گی۔ جہاز رانی کا خیال کرو۔ سمندر کا سفر کس قدر آسان اور آرام دہ ہو جائے گا۔ نہ جہاز کے ڈوبنے کا خطرہ ہوگا، نہ چٹان سے ٹکرانے کا۔ صرف انھیں دو باتوں سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ میں کس قدر دولت مند ہو سکتا ہوں۔ دنیا کے ممالک میرے قبضۂ اقتدار میں ہوں گے اور میں ایک معنی میں تمام دنیا کا بادشاہ ہونگا۔ اور پیاری فیروزہ تم دنیا کی ملکہ ہوگی! سچ پوچھو تو میں نے اس ایجاد کا خیال صرف تمھاری وجہ سے کیا، تاکہ میں پولیس اور قانون کی دسترس سے محفوظ رہوں۔ اب میں چاند میں یا کسی پہاڑ کی ناممکن گذر چوٹی پر اپنا محل بناؤنگا اور اطمینان کے ساتھ فیروزہ سے ہنس بول سکوں گا۔ ابتدا میں مجھے خیال بھی نہ تھا کہ ردّ ثقل ایجاد ہوتے ہی میں دنیا کا سب سے زیادہ مالدار اور طاقتور آدمی ہو جاؤں گا۔ اس ایجاد سے دنیا میں ہلکہ مچ جائے گا اور ہر چیز میں انقلاب ہو جائے گا۔ گھڑ دوڑ اور موٹر گاڑیوں کو کوئی ٹکے کو بھی نہ پوچھے گا۔ جو سفر ریل اور جہاز کے ذریعہ سے دنوں اور مہینوں میں ہوتا ہے، منٹوں میں اور گھنٹوں میں ہونے لگے گا۔ نہ صرف کشمیر بلکہ کیلی فورنیا کے تازہ پھل ہندوستان کے

ہر شہر میں بہ کثرت ملنے لگیں گے۔ بحرین اور خلیج فارس کے موتی کس آسانی سے سمندر کی تہ سے نکلا کریں گے۔ یورپ کی جو چیز آج ایک روپیہ میں آتی ہے ٹکے میں بکنے لگے گی!۔

اس کے علاوہ دشمن کے زیر کرنے کا کتنا بڑا آلہ میرے ہاتھ میں ہے۔ میں آج چاہوں تو اس ایجاد کی مدد سے ممالک کو زیر و زبر کر دوں۔ جرمنی کا کوئی شہر بربادی سے نہ بچ سکے۔ جرمنی کے زیپلین فوکر اور اسی طرح کے اور شیطانی آلات سب بیکار ہو جائیں۔ سواری اور بار برداری کے جہاز بجائے پانی میں چلنے کے ہوا میں اُڑنے لگیں گے اور دشمن کے تارپیڈو سے محفوظ ہو جائیں گے لیکن بہرام صلح پسند ہے۔ اپنے دماغ اور اپنی دولت سے خلق کو آرام و آسایش پہونچانا چاہتا ہے۔ بربادی اور خونریزی کو گناہِ عظیم سمجھتا ہے۔ مسعود، خدا نہ کرے کہ وہ وقت آئے کہ ملک کو بہرام کی امداد کی ضرورت پڑے لیکن اگر ایسا ہوا تو بہرام اپنی تمام قوت سے دشمن کے زیر کرنے میں تیار ہوگا اور انشاءاللہ فتح پاکر رہے گا!!۔

مسعود میں نے تمھیں آج اس لیے تکلیف دی ہے کہ تم اس نئی ایجاد کا حال حضور والیسرائے بہادر کی خدمت میں بیان کر دو۔

مسعود دیکھتے ہو، وہ علی گڈھ نظر آرہا ہے آج کالج میں بیگم صاحبہ بھوپال کی آمد کی دھوم ہو رہی ہوگی۔ کالج جھنڈیوں اور پھول پتیوں سے دولھن بن رہا ہوگا۔ تمھارا دل ضرور چاہتا ہوگا کہ اسٹرچی ہال کے جلسۂ خیر مقدم میں شریک ہو اور کرکٹ پویلین میں اپنے دوستوں کے ساتھ چاء پیو۔ اس لیے میں تمھیں قلعہ کے قریب اُوسر میں اُتارے دیتا ہوں۔ وہاں تمھیں ایک موٹر سواری کے لیے

ملے گا۔ جس وقت کالج کی پرلطف صحبتوں میں بیٹھو اور اپنے کارناموں کا تذکرہ کرو
بہرام کو کلمۂ خیر سے یاد کرنا۔"

یہ کہکر نیچے کی کھڑکیاں کھول دیں جس سے کُرہ بڑی سرعت کے ساتھ زمین کی طرف گرنا شروع ہوا۔ مسعود نے کرسی کے ڈنڈوں کو خوب مضبوط پکڑ لیا اور سمجھتا تھا کہ اگر اسی رفتار سے گولہ زمین پر گرا تو پاش پاش ہو جائے گا لیکن بہرام نے زمین سے دو چار سو گز کے فاصلہ پر نیچے کی کھڑکیاں بند کر دیں اور جلد جلد کبھی اوپر کی کھڑکیاں کھولیں کبھی نیچے کی۔ اس عمل سے رفتار کی تیزی بالکل قابو میں آگئی اور گولہ اس طرح زمین پر آ رہا کہ محسوس بھی نہ ہوا۔

بہرام نے دروازہ کھولا اور بڑے تپاک سے مسعود سے مصافحہ کیا۔ مسعود نے فیروزہ بانی کو بہت جھک کے سلام کیا اور باہر آگیا۔

ادھر مسعود نے زمین پر قدم رکھا۔ بہرام نے خدا حافظ کہکر دستہ دبایا اور گولہ آسمان کی طرف اُڑ گیا۔

تمت

نومبر سنہ ۱۹۲۶ء